اوراقِ ادب

انتخاب نظم و نثر

یونیورسٹی کی اعلا جماعتوں کے لیے

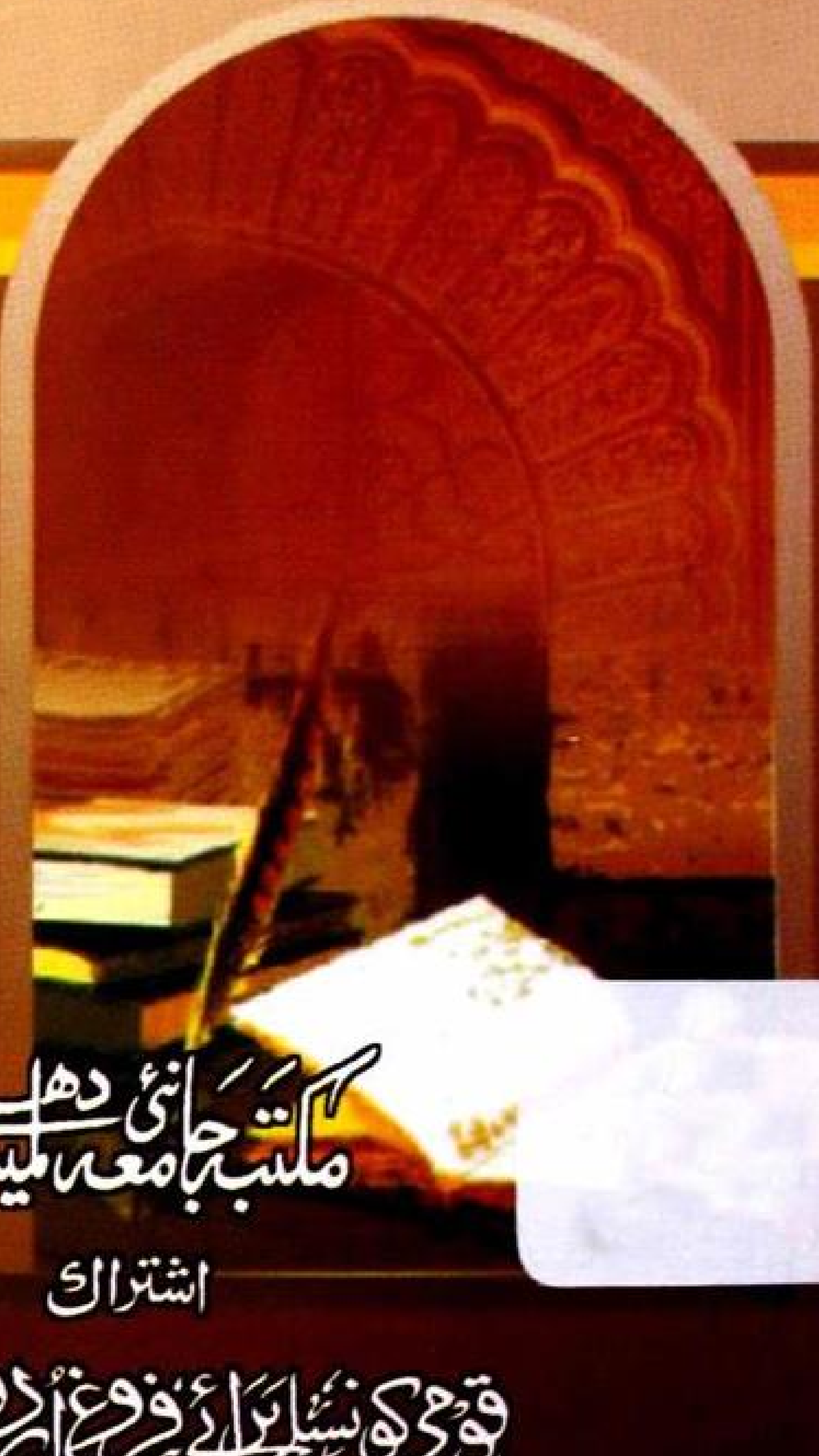

مرتبین

سید محی رضا ۔ آدم شیخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

اوراق ادب

انتخاب نظم و نثر

یونیورسٹی کی اعلا جماعتوں کے لیے

مرتبین

سید محی رضا۔ آدم شیخ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

Auraq-e-Adab
Edited by
Seyd Muhi Raza- Aadam Shaikh
Rs.74/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2013 تعداد: 1100 قیمت: -/74 روپے

ISBN :978-81-7587-938-6 سلسلہ مطبوعات: 1720

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099

ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی۔110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد وگرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلا شرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیر نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہورہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہِ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

فہرست

حصہ نثر:

(۱)	شروع قصے کا	میر امّن	۱۱
(۲)	گزار ہوا زمانہ	سر سید احمد خاں	۱۲
(۳)	میر محمد تقی میرؔ	محمد حسین آزاد	۲۰
(۴)	غزل	خواجہ الطاف حسین حالی	۲۴
(۵)	مردہ بدست زندہ	فرحت اللہ بیگ	۳۰
(۶)	اردو شاعری	برج نرائن چکبست	۳۶
(۷)	اچھوتا پن	عبدالحلیم شرر	۴۲
(۸)	ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	۴۷
(۹)	کفن	پریم چند	۵۱
(۱۰)	جگر مراد آبادی	شاہد احمد دہلوی	۶۰
(۱۱)	زنداں نامہ	ابوالکلام آزاد	۶۸
(۱۲)	انار کلی	امتیاز علی تاج	۷۳

(۱۳) علی گڑھ کے مشاعرے — رشید احمد صدیقی — ۷۷
(۱۴) پشکن کے دیس میں — جگن ناتھ آزاد — ۸۱
(۱۵) زیرلب — صفیہ اختر — ۸۴

حصہ نظم

غزلیات

(۱) ولی اورنگ آبادی
مت غصہ کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا — ۸۹
قرار تیئں ہے مرے دل کوں اے سجن تجھ بن — ۹۰
(۲) میر تقی میر
چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے — ۹۱
گئے تھے سیر چمن کو اٹھ کر گلوں میں ٹک جی لگا نہ اپنا — ۹۱
(۳) مرزا غالب
غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے — ۹۲
کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا — ۹۳
(۴) فانی بدایونی
دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے — ۹۴
آل سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ — ۹۵
(۵) مرزا یاس یگانہ چنگیزی
کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے — ۹۶
مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا — ۹۷

(۶) سیماب اکبر آبادی

دل اکثر شکر یہ سنجِ جفائے یار ہوتا ہے ۹۸

مُغنی جاگتی سی اک فضا تیار ہو جائے ۹۹

(۷) مجروح سلطانپوری

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے ۱۰۰

دُشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ ۱۰۰

(۸) عزیز قیسی

ہر آنکھ لہو ساگر ہے میاں ہر دل پتھر سناٹا ہے ۱۰۱

رات کی رات پڑاؤ کا میلہ، کوچ کی دھول سویرے ۱۰۱

(۹) قیصر الجعفری

حصہ مرے مکاں کا شبِ ماہ میں نہ تھا ۱۰۲

پھر مرے سر پہ کڑی دھوپ کی بوچھار گری ۱۰۲

(۱۰) ظفر گورکھپوری

زندگی نے مجھے سوغات انوکھی دی ہے ۱۰۳

دیکھیں قریب سے بھی تو اچھا دکھائی دے ۱۰۳

نظمیں

(۱۱)	روٹی	نظیر اکبر آبادی	۱۰۴
(۱۲)	ہاتھی	مرزا محمد رفیع سودا	۱۰۴
(۱۳)	مناجات و شہادت امام حسینؑ	میر ببر علی انیس	۱۰۷
(۱۴)	ساقی نامہ	محمد اقبال	۱۰۹
(۱۵)	کتے	فیض احمد فیض	۱۱۲
(۱۶)	نوالہ	علی سردار جعفری	۱۱۳
(۱۷)	مرے عہد کے حسینو	ساحر لدھیانوی	۱۱۶
(۱۸)	ایک لڑکا	اختر الایمان	۱۴۴

رباعیات

(۱۹) فراق گورکھپوری ۱۱۹

(۲۰) جوش ملیح آبادی ۱۱۹

(۲۱) امجد حیدر آبادی ۱۲۰

(۲۲) جاں نثار اختر ۱۲۰

حرف آغاز

کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے نظم ونثر کا مناسب انتخاب تیار کرنا کوئی آسان کام نہیں، اس ضمن میں کئی تقاضوں اور مطالبوں کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔

اس انتخاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ کلاسیکی اور جدید نثری و شعری تخلیقات کو شامل کیا جائے۔ ہم ممبئی یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز اِن اردو کے صدر وارا کین کے شکر گزار ہیں کہ نظم ونثر کے اس انتخاب میں انھوں نے مرتبین کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور اسے ہر پہلو سے طلبہ کے لیے مفید اور معلوماتی بنانے میں ہم سے ہر ممکنہ تعاون کیا۔

زیر نظر انتخاب میں قدیم وجدید ادبا اور شعرا کی بہترین تخلیقات کو جگہ دی گئی ہے تاکہ طلبہ اردو شعر وادب کے مختلف مرحلوں سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کر سکیں۔ اس انتخاب کو اس نقطۂ نظر سے بھی تیار کیا گیا ہے کہ یہ بی۔ اے، بی۔ کام یا بی۔ ایس۔ سی کے کسی بھی درجے میں پڑھائی جا سکے۔

حصہ نثر میں جو مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ نفس مضمون اور اسالیب بیان کے لحاظ سے متنوع اور مختلف ہیں، اسی طرح حصہ نظم بھی روایتی پابندیوں سے ہٹ کر ترتیب دیا گیا ہے۔

مرتبین، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی کے ممنون ہیں کہ وہاں کے ارباب حل وعقد نے اس انتخاب کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں امید ہے کہ ''اوراق ادب'' کا مطالعہ، طلبہ میں معیاری کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا کر سکے گا۔

۲۲ر مارچ ۱۹۹۹ء

(ڈاکٹر) سیّد محی رضا
(ڈاکٹر) آدم شیخ

حصہ نثر

میر امّن

شروع قصے کا

اب آغاز قصے کا کرتا ہوں، ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔ سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے، اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے، روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا، کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت، اس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا آزاد بخت، اور شہر قسطنطنیہ، (جس کو استنبول کہتے ہیں) اس کا پائے تخت تھا۔ اس کے وقت میں رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفہ، غریب غربا آسودہ، ایسے چین سے گزران کرتے اور خوشی سے رہتے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید، اور رات شب برات تھی۔ اور جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغاباز تھے، سب کو نیست و نابود کر کر نام و نشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا تھا۔ ساری رات دروازے گھروں کے بند نہ ہوتے اور دکانیں بازار کی کھلی رہتیں۔ راہی، مسافر، جنگل میدان میں سونا اچھالتے چلے جاتے، کوئی نہ پوچھتا کہ تمھارے منہ میں کے دانت ہیں، اور کہاں جاتے ہو؟

اس بادشاہ کے عمل میں ہزاروں شہر تھے، اور کئی سلطان نعل بندی دیتے۔ ایسی بڑی سلطنت پر، ایک ساعت اپنے دل کو خدا کی یاد اور بندگی سے غافل نہ کرتا۔ آرام دنیا کا جو چاہیے سب موجود تھا، لیکن فرزند کہ زندگانی کا پھل ہے، اس کی قسمت کے باغ میں نہ تھا۔ اس خاطر اکثر فکر مند رہتا، اور پانچوں وقت کی نماز کے بعد اپنے کریم سے کہتا کہ "اے اللہ! مجھ عاجز کو

تو نے اپنی عنایت سے سب کچھ دیا' لیکن ایک اس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا۔ یہی ارمان جی میں باقی ہے کہ میرا نام لیوا اور پانی دیوا کوئی نہیں' اور تیرے خزانۂ غیب میں سب کچھ موجود ہے' ایک بیٹا جیتا جاگتا مجھے دے' تو میرا نام اور اس سلطنت کا نشان قائم رہے۔"

اسی امید میں بادشاہ کی عمر چالیس برس کی ہو گئی۔ ایک دن شیش محل میں نماز ادا کر کر' وظیفہ پڑھ رہے تھے' ایک بارگی آئینے کی طرف خیال جو کرتے ہیں' تو ایک سفید بال موچھوں میں نظر آیا' کہ مانند تار مقیش کے چمک رہا ہے۔ بادشاہ دیکھ کر آب دیدہ ہوئے اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر دل میں اپنے سوچ کیا کہ افسوس! تو نے اتنی عمر ناحق برباد کی' اور اس دنیا کی حرص میں ایک عالم کو زیر و زبر کیا۔ اتنا ملک جو لیا' اب تیرے کس کام آوے گا؟ آخر یہ سارا مال اسباب کوئی دوسرا اڑا دے گا۔ تجھے تو پیغام موت کا آ چکا' اگر کوئی دن جیے بھی' تو بدن کی طاقت کم ہو گی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میری تقدیر میں نہیں تھا کہ وارث چھتر اور تخت کا پیدا ہو۔ آخر ایک روز مرنا ہے اور سب کچھ چھوڑ جانا ہے' اس سے یہی بہتر ہے کہ میں ہی اسے چھوڑ دوں اور باقی زندگی اپنے خالق کی یاد میں کاٹوں۔

یہ بات اپنے دل میں ٹھہرا کر' پائیں باغ میں جا کر' سب مجرائیوں کو جواب دے کر' فرمایا کہ کوئی آج سے میرے پاس نہ آوے' سب دیوان عام میں آیا جایا کریں اور اپنے کام میں مستعد رہیں۔ یہ کہہ کر' آپ ایک مکان میں جا بیٹھے اور مصلا بچھا کر' عبادت میں مشغول ہوئے۔ سوائے رونے اور آہ بھرنے کے کچھ کام نہ تھا۔ اسی طرح بادشاہ آزاد بخت کو کئی دن گزرے' شام کو روزہ کھولنے کے وقت ایک چھہارا کھاتے اور تین گھونٹ پانی پیتے اور تمام دن رات جانماز پر پڑے رہتے۔ اس بات کا باہر چرچا پھیلا' رفتہ رفتہ تمام ملک میں خبر گئی کہ بادشاہ نے بادشاہت سے ہاتھ کھینچ کر' گوشہ نشینی اختیار کی۔ چاروں طرف غنیموں اور مفسدوں نے سر اٹھایا اور قدم اپنی حد سے بڑھایا۔ جس نے چاہا' ملک دبا لیا اور سرانجام سرکشی کا کیا۔ جہاں کہیں حاکم تھے' ان کے حکم میں خلل عظیم واقع ہوا۔ ہر ایک صوبے سے عرضی بد عملی کی حضور میں پہنچی۔ درباری امرا جتنے تھے' جمع ہوئے اور صلاح مصلحت کرنے لگے۔

آخر یہ تجویز ٹھہری کہ نواب وزیر' عاقل اور دانا ہے' اور بادشاہ کا مقرب اور معتمد ہے' اور درجے میں بھی سب سے بڑا ہے' اس کی خدمت میں چلیں' دیکھیں' وہ کیا مناسب جان کر کہتا ہے۔ سب عمدہ' امیر' وزیر کے پاس آئے اور کہا: بادشاہ کی یہ صورت اور ملک کی وہ

حقیقت اگرچندے اور تغافل ہوا' تو اس محنت کا ملک لیا ہوا' مفت میں جاتا رہے گا' پھر ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ وزیر پرانا' قدیم' نمک حلال اور عقل مند' نام بھی خردمند' اسم بامسمیٰ تھا' بولا: اگرچہ بادشاہ نے حضور میں آنے کو منع کیا ہے' لیکن تم چلو' میں بھی چلتا ہوں' خدا کرے بادشاہ کی مرضی آوے' روبہ روبلاوے۔ یہ کہہ کر' سب کو اپنے ساتھ دیوان عام تلک لایا۔ ان کو وہاں چھوڑ کر' آپ دیوان خاص میں آیا' اور بادشاہ کی خدمت میں محلی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ یہ پیر غلام حاضر ہے' کئی دنوں سے جمال جہاں آرا نہیں دیکھا' امیدوار ہوں کہ ایک نظر دیکھ کر' قدم بوسی کروں' تو خاطر جمع ہو۔ یہ عرض وزیر کی بادشاہ نے سنی' ازبس کہ قدامت اور خیر خواہی اور تدبیر اور جاں نثاری اس کی جانتے تھے' اور اکثر اس کی بات مانتے تھے' بعد تامل کے فرمایا: خردمند کو بلالو۔ بارے جب پروانگی ہوئی' وزیر حضور میں آیا' آداب بجالایا' اور دست بستہ کھڑا رہا۔ دیکھا تو بادشاہ کی عجب صورت بن رہی ہے کہ زار بہ زار رونے اور دبلاپے سے' آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور چہرہ زرد ہو گیا ہے۔

خردمند کو تاب نہ رہی' بے اختیار دوڑ کر قدموں پر جا گرا۔ بادشاہ نے ہاتھ سے سر اس کا اٹھایا اور فرمایا: لو' مجھے دیکھا' خاطر جمع ہوئی؟ اب جاؤ' زیادہ مجھے نہ ستاؤ' تم سلطنت کرو۔ خردمند سن کر' ڈاڑھ مار کر رویا اور عرض کی: غلام کو آپ کے تصدق اور سلامتی سے ہمیشہ بادشاہت میسر ہے' لیکن جہاں پناہ کی یک بہ یک اس طرح کی گوشہ گیری سے تمام ملک میں تہلکہ پڑ گیا ہے' اور انجام اس کا اچھا نہیں۔ یہ کیا خیال مزاج مبارک میں آیا؟ اگر اس خانہ زاد موروثی کو بھی محرم اس راز کا کیجیے تو بہتر ہے' جو کچھ عقل ناقص میں آوے' التماس کرے۔ غلاموں کو جو یہ سرفرازیاں بخشی ہیں' اسی دن کے واسطے کہ بادشاہ عیش و آرام کریں' اور نمک پروردے تدبیر میں ملک کی رہیں۔ خدانہ خواستہ' جب فکر' مزاج عالی کے لاحق ہوئی' تو بندہ ہائے پادشاہی کس دن کام آویں گے؟ بادشاہ نے کہا: سچ کہتا ہے' پر' جو فکر میرے جی کے اندر ہے' سو تدبیر سے باہر ہے۔

سن اے خردمند! میری ساری عمر اسی ملک گیری کے دردسر میں کٹی' اب یہ سن و سال ہوا' آگے موت باقی ہے' سو اس کا بھی پیغام آیا کہ سیاہ بال سفید ہو چلے۔ وہ مثل ہے: ساری رات سوئے' اب صبح کو بھی نہ جاگیں؟ اب تلک ایک بیٹا پیدا نہ ہوا جو میری خاطر جمع ہوتی' اس لیے دل سخت اداس ہوا اور میں سب کچھ چھوڑ بیٹھا' جس کا جی چاہے' ملک لے یا مال لے' مجھے

کچھ کام نہیں۔ بلکہ کوئی دن میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر، جنگل اور پہاڑوں میں نکل جاؤں، اور منہ اپنا کسو کو نہ دکھاؤں، اسی طرح یہ چند روز کی زندگی بسر کروں۔ اگر کوئی مکان خوش آیا تو وہاں بیٹھ کر، بندگی اپنے معبود کی بجالاؤں گا۔ شاید عاقبت بہ خیر ہو۔ اور دنیا کو تو خوب دیکھا، کچھ مزہ نہ پایا۔ اتنی بات بول کر، اور ایک آہ بھر کر، بادشاہ چپ ہوئے۔

خردمند اُن کے باپ کا وزیر تھا، جب یہ شہزادے تھے، تب سے محبت رکھتا تھا۔ علاوہ دانا اور نیک اندیش تھا، کہنے لگا: خدا کی جناب سے ناامید ہونا ہرگز مناسب نہیں۔ جس نے ہیژدہ ہزار عالم کو ایک حکم میں پیدا کیا، تمھیں اولاد دینی اس کے نزدیک کیا بڑی بات ہے؟ قبلۂ عالم! اس تصورِ باطل کو دل سے دور کرو، نہیں تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اور یہ سلطنت کس کس محنت اور مشقت سے تمھارے بزرگوں نے اور تم نے پیدا کی ہے؟ ایک ذرا میں ہاتھ سے نکل جائے گی، اور بے خبری سے ملک ویران ہو جائے گا۔ خدا نہ خواستہ بدنامی حاصل ہوگی۔ اس پہ بھی باز پرس روزِ قیامت کی ہوا چاہے کہ تجھے بادشاہ بنا کر، اپنے بندوں کو تیرے حوالے کیا تھا، تو ہماری رحمت سے مایوس ہوا اور رعیت کو حیران پریشان کیا! اس سوال کا کیا جواب دو گے؟ پس، عبادت بھی اس روز کام نہ آوے گی، اس واسطے کہ آدمی کا دل خدا کا گھر ہے۔ اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جائیں گے۔ غلام کی بے ادبی معاف ہو، گھر سے نکل جانا اور جنگل جنگل پھرنا کام جوگیوں اور فقیروں کا ہے، نہ کہ بادشاہوں کا۔ تم اپنے جوگا کام کرو، خدا کی یاد اور بندگی، جنگل پہاڑ پر موقوف نہیں۔ آپ نے یہ بیت سنی ہوگی

خدا اس پاس، یہ ڈھونڈھے جنگل میں

ڈھنڈھورا شہر میں، لڑکا بغل میں

اگر منصفی فرمایئے، اور اس فدوی کی عرض قبول کیجیے، تو بہتر یوں ہے کہ جہاں پناہ ہر دم اور ہر ساعت دھیان اپنا خدا کی طرف لگا کر، دعا مانگا کریں۔ اس کی درگاہ سے کوئی محروم نہیں رہا۔ دن کو بندوبست ملک کا اور انصاف، عدالت غریب غربا کی فرماویں، تو بندے خدا کے دامنِ دولت کے سایے میں امن وامان خوش گزراں رہیں۔ اور رات کو عبادت کیجیے، اور درود پیمبر کی روح پاک کو نیاز کر کر، درویش گوشہ نشین، متوکلوں سے مدد لیجیے۔ اور روز راتب یتیم، اسیر، عیال داروں، محتاجوں اور رانڈ بیواؤں کو کر دیجیے۔ ایسے اچھے کاموں اور نیک نیتوں کی برکت سے، خدا چاہے تو امید قوی ہے کہ تمھارے دل کے مقصد اور مطلب سب پورے

ہوں۔ اور جس واسطے مزاج عالی مکدر ہو رہا ہے' وہ آرزو بر آوے' اور خوشی خاطر شریف کو ہو جاوے۔ پروردگار کی عنایت پر نظر رکھیے کہ وہ ایک دم میں جو چاہتا ہے' سو کرتا ہے۔ بارے' خردمند وزیر کے ایسی ایسی عرض معروض کرنے سے' آزاد بخت کے دل کو ڈھارس بندھی۔ فرمایا: اچھا' تو جو کہتا ہے' بھلا یہ بھی کر دیکھیں' آگے جو اللہ کی مرضی ہے' سو ہو گا۔

جب بادشاہ کے دل کو تسلی ہوئی' تب وزیر سے پوچھا کہ اور سب امیر و دبیر کیا کرتے ہیں اور کس طرح ہیں؟ اس نے عرض کی کہ سب ارکان دولت' قبلہ عالم کے جان و مال کو دعا کرتے ہیں' آپ کی فکر سے سب حیران و پریشان ہو رہے ہیں' جمال مبارک اپنا دکھایئے تو سب کی خاطر جمع ہووے' چنانچہ اس وقت دیوان عام میں حاضر ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ نے حکم کیا: انشاء اللہ تعالیٰ کل دربار کروں گا' سب کو کہہ دو' حاضر رہیں۔ خردمند یہ وعدہ سن کر خوش ہوا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا دی کہ جب تلک یہ زمین و آسماں برپا ہیں' تمھارا تاج و تخت قائم رہے۔ اور حضور سے رخصت ہو کر خوشی خوشی باہر نکلا اور یہ خوشخبری امراؤں سے کہی۔ سب امیر ہنسی خوشی گھر کو گئے۔ سارے شہر میں آنند ہو گئی۔ رعیت پر جا مگن ہوئی کہ کل بادشاہ دربار عام کرے گا۔ صبح کو سب خانہ زاد اعلا ادنا' اور ارکان دولت چھوٹے بڑے' اپنے اپنے پایے اور مرتبے پر آ کر کھڑے ہوئے' اور منتظر جلوۂ بادشاہی کے تھے۔

سر سید احمد خاں

گزرا ہوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڈھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈراونی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی تڑپ تڑپ کر کڑکتی ہے۔ آندھی بڑے زور سے چلتی ہے' دل کانپتا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڈھا نہایت غمگین ہے مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر نہ اکیلے پن پر اور نہ اندھیری رات اور نہ بجلی کی کڑک اور نہ آندھی کی گونج پر اور نہ برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے' اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بہے چلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے جب کہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپیا اشرفی کے بجائے ریوڑی' مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر' ماں باپ' بھائی بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لیے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل مین لیے مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ غمگین ہوتا تھا اور بے اختیار چلا اٹھتا تھا "ہائے وقت' ہائے گزرے ہوئے زمانے' افسوس کہ میں نے تجھے بڑی دیر میں یاد کیا۔"

پھر وہ جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ و سفید چہرہ' سڈول ڈیل' بھرا ابھرا بدن' رسیلی آنکھیں' موتی کی لڑی سے دانت' امنگ سے بھرا دل' جذبات انسانی کے جوشوں کی خوشی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں' ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے اور نیکی و خدا پرستی کی بات بتاتے تھے تو یہ کہتا تھا "آہ ابھی وقت ہے" اور بڑھاپا آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا

اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا۔ "آہ وقت گزر گیا۔ آہ وقت گزر گیا' اب پچھتائے کیا ہوتا ہے۔ افسوس میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ "ابھی وقت بہت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹٹول ٹٹول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھول کر دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراونی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل بیٹھا جاتا ہے' ہولناک آندھی چل رہی ہے۔ درختوں کے پتے اڑتے ہیں اور ٹہنے ٹوٹتے ہیں' تب وہ چلا کر بولا "ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی بھی ایسی ہی ڈراونی ہے جیسی یہ رات۔" یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنے ماں باپ' بھائی بہن' دوست آشنا یاد آئے جن کی ہڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو چھاتی سے لگائے' آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے' یہ کہتی ہوئی کہ "ہائے بیٹا وقت گزر گیا۔" باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں سے یہ آواز آتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تمھارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔" بھائی بہن دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے' دوست آشنا سب غمگین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی ہیں جو اُس نے نہایت بے پروائی اور بے مروتی اور کج خلقی سے اپنے ماں باپ' بھائی بہن دوست آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا' باپ کو ناراض کرنا' بھائی بہن سے بے مروت رہنا' دوست آشنا کے ساتھ ہمدردی نہ کرنا یاد آتا تھا اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر چلا اٹھتا تھا کہ "ہائے وقت نکل گیا۔ ہائے وقت نکل گیا۔ اب کیونکر اس کا بدلہ ہو۔"

وہ گھبرا کر کھڑکی کی طرف دوڑا اور ٹکراتا ٹکراتا کھڑکی تک پہنچا' اس کو کھولا اور یکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے اور بجلی کی کڑک کچھ تھمی ہے' پر رات ویسی ہی اندھیری ہے س کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اتنے میں اس کو اپنا ادھیڑپن یاد آیا جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی اور نہ جوانی کا جوبن۔

نہ وہ دل رہا تھا اور نہ دل کے ولولوں کا جوش۔ اس نے اپنی اس نیکی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت بدی کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا، نمازیں پڑھنی، حج کرنا، زکوۃ دینا، بھوکوں کو کھانا کھلانا، مسجدیں اور کنویں بنوانا، یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کو جن سے بیعت کی تھی، اپنی مدد کو پکارتا تھا مگر دل کی بے قراری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا کہ اس کے ذاتی اعمال کا اسی تک خاتمہ ہے۔ بھوکے پھر ویسے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر کھنڈر ہیں یا پھر ویسے ہی جنگل ہیں۔ کنویں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر نہ فقیر کوئی اس کی آواز نہیں سنتا اور نہ مدد کرتا ہے۔ اس کا دل گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا جو تمام فانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پچھلی سمجھ پہلے ہی کیوں نہ آئی۔ اب کچھ بس نہیں چلتا اور پھر یہ کہہ کر چلا اٹھا "ہائے وقت، ہائے وقت، میں نے تجھ کو کیوں کھودیا؟"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اس کے پٹ کھولے تو دیکھا کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی تھم گئی ہے۔ گھٹا کھل گئی ہے۔ تارے نکل آئے ہیں۔ ان کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بہلانے کے لیے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک اس کو آسمان کے بیچ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خوب صورت دلہن نظر آئی۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا وہ قریب ہوتی جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آگئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک دل اور محبت کے لہجے میں اس سے پوچھا کہ تمھاری تسخیر کا بھی کوئی عمل ہے؟ وہ بولی "ہاں نہایت آسان، پر بہت مشکل، جو کوئی خدا کا فرض ادا کر کے انسان کی بھلائی اور اس کی بہتری میں سعی کرے اس کی میں مسخر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، انسان ہی ایسی چیز ہے جو اخیر تک رہے گا پس جو بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لیے کی جاتی ہے وہ نسل در نسل اخیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوۃ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں جو مجھے تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے، کم سے کم، قوم کی بھلائی میں دل و جان و مال سے مساعی ہو" یہ کہہ کر وہ دلہن غائب ہو گئی اور بڈھا

پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اب پھر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی پچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام اپنی ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کیے تھے' خاص قومی بھلائی کی نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اپنا حال سوچ کر وہ اس دلفریب دلہن کے ملنے سے مایوس ہوا' اپنا اخیر زمانہ دیکھ کر آیندہ کرنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کے عالم میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا "ہائے وقت' ہائے وقت' کیا پھر میں تجھے بلا سکتا ہوں؟ ہائے میں دس ہزار دینار بھی دیتا اگر وقت پھر آتا اور میں جوان ہو سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک آہِ سرد بھری اور بے ہوش ہو گیا۔

پس اے میرے پیارے نوجوان ہم وطنو اور اے میری قوم کے بچو!

اپنی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تاکہ اخیر وقت میں اس بڈھے کی طرح نہ پچھتاؤ۔

ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔ آمین!

محمد حسین آزاد

میر محمد تقی میر

میرؔ تخلص، محمد تقی نام۔ خلف میر عبداللہ۔ شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ سراج الدین علی خان آرزو' زبان فارسی کے معتبر مصنف اور مسلّم الثبوت محقق ہندوستان میں تھے۔ گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ "میر صاحب کا ان سے دور کا رشتہ تھا اور تربیت کی نظر پائی تھی"۔ عوام میں ان کے بھانجے مشہور ہیں۔ در حقیقت بیٹے میر 'عبداللہ کے تھے مگر ان کی پہلی بی بی سے تھے۔ وہ مر گئیں تو خان آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی۔ اس لیے سوتیلے بھانجے ہوئے۔ میر صاحب کو ابتدا سے شعر کا شوق تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دلّی میں آئے اور خان آرزو کے پاس انھوں نے اور ان کی شاعری نے پرورش پائی۔ مگر خاں صاحب حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ۔ اس پر نازک مزاجی غضب! غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہوگئے۔ بد نظر زمانہ کا دستور ہے کہ جب کسی نیک نام کے دامن شہرت کو ہوا میں اڑتے دیکھتا ہے تو ایک داغ لگا دیتا ہے' چنانچہ تذکرۂ شورش میں لکھا ہے کہ خطاب سیادت انھیں شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا۔ کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سیّد ہو جاؤ گے' اس وقت انھوں نے خیال نہ کیا' رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ سوداؔ کا ایک قطعہ بھی سن رسیدہ لوگوں سے سنا ہے مگر کلیات میں نہیں۔ شاید اس میں یہی اشارہ ہو۔

بیٹھے تنورِ طبع کو جب گرم کرکے میر — کچھ شیر مال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

اخیر میں کہتے ہیں۔

میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد — بیٹا تو گندنا بنے اور آپ کو تھ میر

پھر بھی اتنا کہنا واجب سمجھتا ہوں کہ ان کی مسکینی و غربت اور صبر و قناعت' تقویٰ و طہارت محضر بنا کر ادائے شہادت کرتے ہیں کہ سیادت میں شبہ نہ کرنا چاہیے اور زمانہ کا کیا ہے۔ کس کس کو کیا نہیں کہتا۔ اگر وہ سیّد نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں　　اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

غرض ہر چند کہ تخلص ان کا میر تھا مگر گنجینۂ سخن کی بازی میں آفتاب ہو کر چمکے' قدر دانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں دیکھا۔ اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اڑایا۔ ہندستان میں یہ بات انہی کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر میں لے جاتے تھے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ نحوست اور فلاکت' قدیم سے اہل کمال کے سر پر سایہ کیے ہیں۔ ساتھ اس کے میر صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انھیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا اور وہ وضع داری اور قناعت کے دھوکے میں اسے فخر سمجھتے رہے۔ یہ الفاظ گستاخانہ جو زبان سے نکلے ہیں' راقم روسیاہ ان کی روح پاک سے عفو قصور چاہتا ہے' لیکن خدا گواہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا فقط اس لیے ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں گزارہ کرنا ہے' وہ دیکھیں کہ ایک صاحب جوہر کا جوہر یہ باتیں کیونکر خاک میں ملا دیتی ہیں۔ چنانچہ انھیں کے حالات و مقالات عنقریب اس بیان کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ دلّی میں شاہ عالم کا دربار اور امرا و شرفا کی محفلوں میں ادب ہر وقت ان کے لیے جگہ خالی کرتا تھا اور ان کے جوہر کمال اور نیکی اطوار و اعمال کے سبب سے سب عظمت کرتے تھے مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے' اور وہاں تو خود خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا۔ اس لیے ۱۱۹۰ھ میں دلّی چھوڑنی پڑی۔

جب لکھنو چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلّی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک گاڑی میں بیٹھے مگر باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا۔ حضرت کیا مضایقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں

میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے۔

لکھنو میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے 'ایک سرا میں اترے' معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ رہ نہ سکے اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ 'کھڑکی دار پگڑی' پچاس گز کے گھیر کا جامہ۔ ایک پورا تھان پستولئے کا کمر سے بندھا۔ ایک رومال پٹری دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں' مشروع کا پاجامہ' جس کے عرض کے پائنچے۔ ناگ پھنی کی انی دار جوتی' جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک.. کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار۔ دوسری طرف کٹار' ہاتھ میں جریب' غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنو' نئے انداز' نئی تراشیں' بانکے ٹیڑھے جوان جمع۔ انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بیچارے غریب الوطن' زمانہ کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود وباش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔ کمال کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے۔ رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپے مہینا کر دیا۔

عظمت و اعزاز جوہر کمال کے خادم ہیں۔ اگرچہ انھوں نے لکھنو میں بھی میر صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا مگر انھوں نے بھی بد دماغی اور نازک مزاجی کو جوان کے ذاتی مصاحب تھے اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔ چنانچہ کبھی کبھی نواب کی ملازمت میں جاتے تھے۔

ایک دن نواب مرحوم نے ایک غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو پھر گئے تو پوچھا کہ میر صاحب! ہماری غزل لائے؟ میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی!

مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کر دے۔ اس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب جب طبیعت حاضر ہو گی کہہ دیجیے گا۔

ایک دن نواب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں' آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب کچھ فرمائیے۔ میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بجبیں ہوتے تھے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔ نواب کہے جاتے تھے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے۔ اور بولے کہ پڑھوں کیا' آپ تو مچھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہو گا آپ متوجہ کر لے گا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ ترناگوار گزری۔ غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ نواب کی سواری سامنے سے آگئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گزارہ کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے اور سو برس کی عمر پائی۔ ناسخ نے تاریخ کہی کہ ع

واویلا مُردشہِ شاعراں!

خواجہ الطاف حسین حالی

غزل

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کئے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندستان میں ہوا ہے۔ اگرچہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لئے ہوئی تھی، مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں اکثر اور ہندستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کرلیا ہے۔

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے لکھے پڑھے اور ان پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارا رکھتے ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں 'وجد و سماع کی مجلسوں میں 'لہو و لعب کی صحبتوں میں' تکیوں میں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہے۔ اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں' جو لوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے' وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں۔ جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو سکتے ہیں' کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلہ بیان منقطع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر دائر و سائر اور مرغوب خاص و عوام ہو اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے' اسی لیے ہمارے نزدیک شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے' لیکن غزل کی اصلاح جس قدر

ضروری ہے' اسی قدر دشوار بھی ہے۔ غزل میں جو عام دلفریبی ہے' اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ جو کان مٹے ٹھمری سے مانوس ہو جاتے ہیں' وہ دُھرپت اور خیال سے لذت نہیں اٹھاسکتے۔ داستان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی۔ بوالہوسی اور کام جوئی کی باتوں میں جو مزا ہے' وہ خالص عشق و محبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اوباش کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارا ہے' وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہو سکتا ہے۔ جن مذاقوں پر ہزل و مطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ سرمہ کاجل' کنگھی' چوٹی پر فریفتہ ہیں' وہ حسن ذاتی کی حقیقت تک کیوں کر پہنچ سکتے ہیں لیکن زمانہ باآواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہو گی یا عمارت خود نہ ہو گی!

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا ہے' یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے سعدی' رومی' خسرو' حافظ وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتناء نہیں پایا جاتا۔ ہم نے حیات سعدی میں کسی موقع پر بیان کیا ہے کہ ان کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شور بور تھے۔ ان کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان کی غزل سن کر دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔ وہ خال و خط کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دُنیادار مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ رندی و بدنامی و رسوائی کو صوفیوں کی دلق' ملمع اور زاہدوں کی زہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ مکر و ریا سے' کوئی حماقت' غرور مال و جاہ سے' کوئی شرک خود پرستی و نفس پرستی سے اور کوئی دھوکا دُنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے۔ ان کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل سے نکلا ہے۔

ان لوگوں کی غزل' گو بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ

ہو' لیکن وہ اس حالت کے بالکل مناسب تھی جبکہ قوم نے دنیا کو یاد نیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا۔ ان کے اشعار ان لوگوں کے حق میں تازیانہ کا حکم رکھتے تھے جو حب دنیا اور حب جاہ میں منہمک' خدا سے غافل اور بادہ نخوت میں مدہوش تھے۔ ان سے ظالم' طماع' حریص اور بخیل عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریاکار زاہدوں' واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح امیروں کو عیار فقیروں کے دام تزویر سے بچاتے تھے۔ وہ اہل اللہ اور ارباب صدق و صفا کو نفس امارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے تھے!

اردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن عاشقانہ خیالات' نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اردو غزل گویوں کے ہر طبقے میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز مٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یوماً فَیوماً بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم بجائے اس کے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقے پر نکتہ چینی کریں' یہ زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اس کی اصلاح کے متعلق اہل وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں۔

غزل کے لیے یہ ایک ضروری سی بات قرار پا گئی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ دی جائے تو حالت موجودہ میں اس کا سر سبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا شراب میں سرکہ بن جانے کے بعد سرور قائم رہنا لیکن اصل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہے' جو کیفیت عشق میں ہے وہ تعشق میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی' جو غزلیں محض تقلید اً عاشقانہ لکھی جاتی ہیں' ان میں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بن کر مجلس میں آئے۔ اثر' قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دل میں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اس کیفیت کا بیان ضرور موثر ہو گا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے' جب وہ اپنی سرگذشت بیان کرے گا ضرور اس کے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہو گا جس کی حالت خود اس کی تکذیب کرتی ہے تو اس سے سوائے اس کے

کہ لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔ پس ایک پارسا نوجوان جس کو ہوا وہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی، یا ایک ستر برس کا پیر مرد جس میں بوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی ان کو ہرگز زیبا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھ کر پہلا اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرے۔

مذکورہ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا منشاء خوشی ہو یا غم، یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت یا صبر یا رضا یا قناعت یا توکل یا رغبت یا نفرت یا رحم یا انصاف یا غصہ یا تعجب یا امید یا ناامیدی یا شوق یا انتظار یا حب وطن یا قومی ہمدردی یا رجوع الی اللہ یا حمایت دین ومذہب یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال یا کوئی اور جذبہ، جذبات انسانی میں سے، اس کو بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق ومحبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اس کو ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے اور اب بھی اس صنف کو مجازاً غزل کہا جاتا ہے۔ پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانے کے اقتضاء سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور جذبات کا آئینہ بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول بتلایا ہو، لیکن ہمارے دل میں اس خیال کی حقارت ہو، یا انھوں نے اس کے برعکس پاؤں توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو لیکن ہم میں سے کسی کے دل پر اس کے برخلاف حالت طاری ہو، دونوں صورتوں میں ہمارے منہ سے وہی صدا نکلنی چاہیے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں پر ایک وقت ایسا گزرے کہ مثلاً کوشش وتدبیر ہم کو محض بے سود ولا حاصل معلوم ہو اور دوسرے وقت ہمارے ہی دل میں ایسا جوش پیدا ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ ہو، ہم کو دونوں حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم وکاست کھینچ دینی چاہیے۔ اس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق وغوامض اور جو انقلاب کے جذبات اس کی طبیعت میں آناً فاناً پیدا ہوتے ہیں، وہی منکشف ہوں گے بلکہ قومی اخلاق پر بھی عمدہ

اثر ہو گا کیونکہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور برا دونوں پہلو نہ دکھائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔

بے شک اخلاقی مضامین کو موثر پیرائے میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور بچہ جو چلبلا اور چونچال نہ ہو' دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی لیکن ہمارے معاصرین کے لیے سوز و گداز کا اس قدر مسالہ موجود ہے جو صدیوں تک نبٹر نہیں سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت سا نظر آرہا ہے جس میں برابر کونپلیں پھوٹ رہی ہوں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو اُن کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی چلی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے رہ جائے گی بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واقعے کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا یا کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہو گا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ مٹیریل غزل کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے،

جس طرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں اسی طرح اس کی زبان بھی ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی کیونکہ چند معمولی مضامین جب صدیوں تک برابر رٹے جاتے ہیں تو زبان کا ایک خاص حصہ ان کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے جو کہ زبانوں پر بار بار آنے اور کانوں سے بار بار سننے کے سبب زیادہ مانوس اور گوارا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ جو انھیں کے ہم معنی ہوں استعمال کیے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

گلاب کے تختے میں کانٹے بھی پھولوں کے ساتھ نبھ جاتے ہیں' مگر ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے۔ اسی واسطے جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اور اخلاق پر رکھی ہے انھیں

بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے۔ عشقیہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر اطلاق کیے جاتے تھے انھیں الفاظ کو ان بزرگوں نے مجاز و استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور رمز و کنایہ میں اپنے اعلا خیالات ظاہر کیے ہیں۔ پس غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ آج تک فارسی یا اردو میں جن لوگوں کی غزل مقبول ہوئی ہے وہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس اصول کو نصب العین بنا رکھا ہے۔ اردو میں دلّی سے لے کر انشا اور مصحفی تک عموماً سب کی غزل میں صفائی' سادگی' روزمرہ کی پابندی' بیان میں گھلاوٹ' اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے۔ ان کے بعد دلّی میں ممنون' غالب' مومن اور شیفتہ وغیرہ کے ہاں فارسی ترکیبوں نے اردو غزل میں بلاشک زیادہ دخل پایا' مگر یہ لوگ بھی اعلا درجہ کا شعر اسی کو سمجھتے تھے جس میں پاکیزہ اور بلند خیال ٹھیٹ اردو کے محاورے میں ادا ہو جاتا تھا۔

آج کل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعرا نے کبھی نہیں باندھے تھے' ظاہر کیے جاتے ہیں مگر چونکہ وہ خاص اس زبان میں جو شعرا کی کثرت استعمال سے کانوں میں رچ بس گئی ہے' ادا نہیں کیے جاتے بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہ راست ظاہر ہونا چاہیے ہیں' انھیں الفاظ میں ظاہر کر دیئے جاتے ہیں' اس لیے وہ مقبول خاص و عام نہیں ہوتے۔ لیکن نئی طرز کی عام شاعری اگر سردست مقبول نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں' جب لوگوں کے مذاق رفتہ رفتہ اس سے آشنا ہو جائیں گے اور سچی باتوں کی لذت اور حلاوت سے واقف ہوں گے اس وقت وہ خود بخود مقبول ہو جائے گی۔ البتہ غزل کو ابتداء ہی سے جہاں تک ممکن ہو عام پسند اور مطبوع طبائع بنانا ضروری ہے کیونکہ یہی ایسی صنف ہے جو خاص و عام کی زبان پر جاری ہوتی ہے۔ اس کے اشعار ہر شخص کو بآسانی یاد رہ سکتے ہیں اور یہی تمام خوشی کے جلسوں اور سماع کی مجلسوں اور یاروں کی صحبتوں میں گائی اور پڑھی جاتی ہے۔ پس ملک میں نیچرل شاعری پھیلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کیے جائیں۔ اس کو تمام انسانی جذبات کے ظاہر کرنے کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اس کے اس کو ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو بادی النظر میں اجنبی اور غیر مانوس نہ ہو۔

فرحت اللہ بیگ

مُردہ بدست زندہ

زمانہ نے خلوص دلوں سے مٹادیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسما رہ گیا ہے۔ صرف اس لیے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ ''واہ جیتے جی تو دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔'' اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے۔ میرے ساتھ آیئے۔ آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھادوں۔

یہ لیجیے۔ سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں' غریب بھی ہیں' امیر بھی ہیں' بے چارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں' کچھ پڑھ بھی رہے ہیں' جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازہ پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے ''کیا مر گئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے۔'' اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجیے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازہ کی بھیڑ چھٹ

گئی۔ کچھ ادھر ہو گئے کچھ ادھر۔ آگے آگے جنازہ ہے' اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیوں کر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انھوں نے چال آہستہ کر دی۔ جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیے اجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں۔ یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرض مندوں سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ ایک آیا جھک کر سلام کیا۔ گھر بھر کی مزاج پرسی کی' مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کیے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں۔ اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں' اور اسی سلسلہ میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آگئے اور انھوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کیے۔ غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو کپڑے بدل خاص اسی جنازہ کے لیے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضع داری پر قائم ہیں یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔ دور سے مسجد کو دیکھا اور انھوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انھوں نے وقت گزار دیا۔ ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔ ادھر نماز ختم ہوئی ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازہ کی طرف بڑھے۔ اُدھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا۔ اب راستہ والوں کی سنیے۔ اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے' مرنے

والے کا نام پوچھا۔ مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کے تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لیے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔ موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انہی کے لیے بنی ہیں۔ کسی جنازہ کا سڑک پر سے گزرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے' اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔ کسی کو کیا حق ہے کہ مر کر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔ شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجا رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آ رہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو اس کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے سے ہٹانے کی فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان میں پہنچ ہی گیا۔

قبرستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔ قبرستان کیا ہے خاصا ایک جنگل ہے۔ ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے۔ اس میں ایک سقّے صاحب ان کی بیوی' دس بارہ بچے' پانچ چھ بکریاں' ایک لنگڑا ٹٹو' سو دو سو مرغیاں' پانچ چھ بلیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں۔ جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی گھانس بڑھ کر کمر کمر ہو گئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لیے ہیں۔ نیم' پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔ کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے۔ کسی کا تعویذ ہی غائب ہے۔ کسی چبوترہ کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہیں۔ غرض کس مپرسی نے اس حصہ کی عجیب حالت کر دی ہے۔ دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں وہ کسی قدر صاف ہے اور کیوں نہ ہو۔ پہلے حصہ کا مُردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مُردے تو اپنی قبر کی مرمّت کرنے یا کرانے سے رہے۔ ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے وہ تو روپے کھرے کر چکے۔ اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصہ کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لیے دکان دار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان

والے اپنی پچاس روپے گز والی زمین کو کیوں صاف نہ رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو، پھر تم جانو اور تمھارے مُردے جانیں۔

میاں سقہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ اِدھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور اُدھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لے جاکر پھر قبر پر چڑھا دیے۔ خیر کیا حرج ہے، زندوں کا کام بھی نکل گیا، مُردے بھی خوش ہوگئے۔ اس گھر میں سل بٹا خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالحہ پیس لیا۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اکھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں۔ مرغیاں کچی قبروں کو کرید رہی ہیں۔ بچے یا تو چبوتروں پر لوٹ مار رہے ہیں یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔ کسی بے چارے کی قبر پر چادر پڑی ہے۔ اس پر بی سقنی نے گیہوں سکھانے ڈال دیے ہیں۔ ٹٹوانی کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھانس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے اِدھر اُدھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری۔ کسی کا چونا گرا، کسی کا پتھر گرا، اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیے جائیں تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلہ کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا فوج میں مُحرم بج گیا۔ سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ جھونپڑی میں گھسا اور اناج لینے کو برتن لے، لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں بے پیندے کا تام چینی کا کٹورہ ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی، کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رزاق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت سنیے۔ جنازہ لا کر لبِ گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے۔ کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترہ کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔

کسی نے سقے سے چلم بھرنے کی فرمایش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سُلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پیے جارہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جارہی ہے' سُلفہ پر سُلفہ بھروایا جاتا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض لوگ ہیں کہ گھانس سے بچتے بچاتے قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جارہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے۔ آج شرماشرمی قبرستان میں آگئے ہیں۔ مفت کرم داشتن کی صورت ہے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔ کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے داد سخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا کچھ ان کا سنا۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنے کو نکال ہی لیا۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق و تردید کی جارہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں۔ وعدے لیے جارہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیے' اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی' چادر میں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے مٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اٹھایا۔ آٹھ دس نے غل مچایا۔ سنبھال کے میت بھاری ہے۔ کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو' ہاں آہستہ سے۔" اب میت قبر کے منہ تک آگئی۔ فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے بے تحاشا غُل مچانا شروع کیا۔ کوئی کہتا ہے۔ "ذرا کمر کی چادر کھینچو۔ ارے بھئی اتنا بھی

دم نہیں ہے۔ دیکھنا کہیں قبر کا پاکھانہ گرے۔ ہاں ہاں ذرا اور جھکا کر۔ لا الہ الا اللہ' میت بھاری ہے۔ ذرا سنبھال کے آہستہ آہستہ' بس بھئی بس۔'' کوئی چیخ رہا ہے۔ ''مٹھے کے بندھن کھول دو۔ ارے میاں لو یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف تو کر دو۔ واہ بھئی واہ۔ اتنا بھی نہیں آتا۔ ابھی منہ پورا نہیں پھرا بس بھئی بس۔''

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بے چارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں' کیا نہ کریں' بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست واحباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔ اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے۔ اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ ''یہ کڑی نہیں وہ کڑی لو۔'' کوئی کہتا ہے ''لا حول ولا قوۃ۔ مفت میں سو روپے مار لیے اور کڑیاں دیں تو ایسی۔'' غرض کوئی کچھ کہتا ہے' کوئی کچھ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے۔ منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔ البتہ لفظ ''منہا'' بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دیے جاتے ہیں۔ جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہو گئی تو فاتحہ کی نوبت آئی۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں اور ان کی کیا حالت ہے۔ ہاں ان بے چاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور۔ گھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ کبھی تو کہتے ہیں کہ ''فاصلہ بہت تھا'' کبھی کہتے ہیں' کہ ''آپ کی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہاں آپ کے ہاں سے دگنا مل رہا تھا۔'' بہر حال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میت کا رنگ۔ جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے۔ ان کے دل میں درد پیدا کرے۔ یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کر رہے ہیں۔

برج نرائن چکبست

اردو شاعری

کسی استاد کا شعر ہے ؎

اسیر اے دوست تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں
گرفتار آہنی زنجیر کا یہ ' وہ طلائی کا

ہمارے عزیزان وطن نے جب غیر قوم کی اطاعت قبول کی تو انھیں بھی دو قسم کی زنجیریں پہننا پڑیں۔ فرماں روا قوم کے قانون کے پردے میں جو پابندیاں انھیں برداشت کرنا پڑیں' انھیں لوہے کی زنجیر سمجھنا چاہیے۔ زبان و قلم کی کامل آزادی سے محروم رہنا' انتظام حکومت میں شریک نہ ہونا' قومی آرام و آسایش کے کافی ذریعوں کی فکر میں گرفتار رہنا' ان قانونی پابندیوں کا نتیجہ تھا۔ یہ ایسی گرفتاری تھی جو ہمارے اہل وطن ہمیشہ کم و بیش محسوس کرتے رہے اور اپنی قومی آزادی کے لیے دعا و فریاد کے نعرے بلند کیا کیے۔ پولیٹکل بحث و تحریک کے کارنامے ان لوہے کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی کوشش کے افسانے ہیں۔ مگر ان ظاہری پابندیوں سے بہت زیادہ قابلِ عبرت خیالات کی غلامی تھی جس نے غیر قوم کی حکومت کا سکہ ہمارے دل و دماغ پر جاری کر دیا۔ ہمارے جذبات و خیالات مغربی تہذیب کے مصنوعی اور نمائشی رنگ میں گرفتار ہوگئے اور ہم اپنے قومی حفظ مراتب سے بے خبر ہوگئے۔ میں اس خیالات کی غلامی کے سلسلے کو سونے کی زنجیر کہوں گا جسے ہم نے خوشی سے پہن لیا اور اپنی گرفتاری پر ناز کرنے لگے۔

اس دماغی اور روحانی غلامی نے طبیعتوں کا رنگ کچھ ایسا پلٹ دیا کہ ہم حکمران قوم کے انداز معاشرت کی تقلید کو تہذیب و تربیت کا جوہر سمجھنے لگے۔ قومی وقار کا سودا ہمارے

سروں سے رخصت ہو گیا۔ اکثر صورتوں میں ہمیں اپنے اخلاق و مذہب سے بھی شرم آنے لگی۔ اس قومی بے خبری کے عالم میں ہمیں اپنے قدیم ادب یا لٹریچر سے بھی حجاب آنے لگا۔ انگریزی زبان میں کمال پیدا کرنا، تعلیم و تربیت کا معیار ہو گیا۔ اردو یا ہندی کی زباندانی کی یاد تک دل سے فراموش ہونے لگی۔ ایسے اہل قلم و اہل زبان پیدا ہو گئے جو انگریزی میں فصاحت کے دریا بہا سکتے تھے مگر اپنی مادری زبان کو جنت نصیب بزرگوں کی ناواقفیت و کم نصیبی کا ورثہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ لازمی تھا، اردو زبان اور اردو شاعری کا سفینہ ڈگمگانے لگا۔ یہ صدائیں عام ہو گئیں کہ قدیم رنگ کی اردو شاعری میں سوائے گل و بلبل اور کنگھی چوٹی کے مضامین کے کیا رکھا ہے۔ اکثر انگریز مصنفین نے اردو زبان یا شاعری کے بارے میں جو خامہ فرسائی کی ہے اس کا لفظ لفظ ہمارے ناواقف نوجوانوں کے لیے قرآن و حدیث ہو گیا اور انھوں نے اپنے مغربی استادوں کے خیالات کی غلامی بلا تکلف قبول کر لی۔ جس طرح زندگی کے اکثر صیغوں میں مغربی تہذیب کا نمائشی پہلو ہماری نظروں میں سما گیا تھا اور اصلی جوہروں سے نگاہیں آشنا نہ تھیں۔ اسی طرح انگریزی نقش کے ظاہری رنگ و روپ کو ہم حسن سخن کا معیار سمجھنے لگے اور چونکہ اردو شاعری اس معیار کے کانٹے میں تل نہ سکی لہٰذا وہ قابل نفرین قرار دی گئی۔

اردو شاعری کے فروغ کا آغاز اسلامی تہذیب کے آخری دور میں ہوا جب کہ عیش پرستی و کاہلی نے ہمارے ہم وطنوں کے خیالات و جذبات کی روحانی آگ کو قریب قریب ٹھنڈا کر دیا۔ قومی زندگی کی نبض سست ہو چکی تھی۔ جو کچھ بلند خیالی، وضع داری اور عالی حوصلگی کے جوہر باقی رہ گئے تھے ان کی ہستی بجھتے ہوئے چراغوں کی روشنی سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم اس بدنصیبی کے دور میں اردو زبان کی خوش قسمتی سے چند ایسے باکمال پیدا ہو گئے جو شاعری اور زبان دانی کے جوہر اپنے ساتھ لائے تھے اور جن کے دلوں میں اس قومی زوال کے زمانے میں بھی اپنے بزرگوں کی قدیم حمیت و تہذیب کا اثر باقی تھا۔ میر و سودا، آتش و غالب و انیس نے اپنی شاعری سے جو چراغ روشن کیے، انھیں زمانے کی ہوا ابھی پورے طور سے گل نہیں کر سکی ہے، مگر باوجود ان قدرتی جوہروں کے زمانے کا رنگ ان کے کمال کا دشمن تھا۔ جس دنیا میں وہ رہتے تھے اس کے عام پسند خیالات و جذبات کے حلقوں میں ان کے دل و دماغ جکڑے ہوئے تھے۔ اکثر وہ ان پابندیوں سے آزاد ہونے کی

کوشش کررہے تھے مگر اپنی قومی تہذیب و تربیت کے محدود دائرے سے مجبور ہوجاتے تھے۔ شاید یہی خیال غالب کے دل کو ستا رہا تھا جب اس نے یہ شعر کہا:

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

یا میر انیس نے انھیں پابندیوں سے عاجز آکر مرثیے کا وسیع میدان تلاش کیا لیکن باوجود ان امنگوں کے ہمارے قدیم شاعروں کے مذاق سخن کے آئینے پر بہت کچھ مصنوعی شاعری کا گرد و غبار جم گیا اور ان کا دامن اکثر غیر پاکیزہ خیالات و جذبات کے کانٹوں سے الجھ کر رہ گیا۔ اگر زمانہ کروٹ لیتا اور قومی زندگی میں شاعرانہ مذاق کی ترقی کا پہلو قائم رہتا تو بعد کی نسل قدیم شعرا کے جوہروں کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتی اور جو عیب ان کے کلام میں موجود تھے ان سے زبان و شاعری کو پاک کردیتی، مگر دنیا دوسرے رنگ پر جارہی تھی۔ نئی تہذیب کی اشاعت نے طبیعتوں کا رنگ کچھ اس طرح بدل دیا تھا کہ صحیح مذاق سخن کا قائم ہونا دشوار تھا۔

انگریزی تعلیم نے ملک میں رفتہ رفتہ جو بیداری پیدا کی اسے بھول جانا قومی احسان فراموشی ہے، مگر اس تعلیم کا ایک صریحی اثر ہمارے قومی اخلاق پر بہت خراب پڑا۔ وہ یہ تھا کہ تعلیم محض ذریعہ معاش ہوگئی۔ علم و ادب کی تحصیل سے جو روحانی سرور کا سرمایہ دلوں کو حاصل ہوتا ہے وہ بالکل نظر انداز ہوگیا۔ اس زمانے میں کثرت سے ایسے تعلیم یافتہ بزرگ ملیں گے جنھیں اردو فارسی ہندی یا انگریزی کے مذاق سخن سے ذرا بھی حس نہیں ہے۔ ان کی زندگی شاعرانہ لطافت کے اثر سے بالکل خالی ہے۔ تعلیم نے ان کی آنکھیں صرف اس قدر روشن کردی ہیں کہ وہ کھوٹے کھرے روپے کو پرکھ سکیں۔ قومی مفلسی نے تعلیم کے اس تجارتی شوق پر اور تازیانے کا کام کیا ہے۔ وہ لطیف جذبات و خیالات جن کا تازہ کرنا تعلیم کا اصل منشا ہے اور جن کی نشو و نما سے انسان دنیا کے گرد و غبار سے ہٹ کر روحانی لطافتوں کا حظ اٹھا سکتا ہے، روز بروز سرد ہوجاتے ہیں۔ اس تجارتی تعلیم کے طوفان میں جب کہ شاعرانہ جذبات کی تربیت کی اصلاح کا راستہ ہی بند ہورہا ہے، مذاق سخن کی صحت کی امید رکھنا فضول ہے۔

ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مذاق سخن صحیح و درست نہیں ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات عموماً اردو فارسی ہندی یا سنسکرت کی شاعری سے ناآشنا ہیں۔ انھوں نے اپنا مذاق سخن انگریزی نظم کے مطالعہ سے قائم کیا ہے لیکن ان کے معیار سخن کا دارومدار بہت کچھ انگریزی شاعری کی غلط تعبیر پر ہے۔ انگریزی نظم کے جس پہلو کا اثر ان کے دماغ پر ہوتا ہے اس کا تعلق محض خیالات سے ہے' ان کے دل انگریزی نظم کے اس لطیف پہلو سے پورے طور پر آشنا نہیں ہیں جس کی بنیاد جذبات کی لطافت و نزاکت پر ہے اور جو اصلی جزو شاعری ہے۔ انگریزی نظم ان کے دماغ کو ضرور روشن کر دیتی ہے۔ مگر ان کے دلوں میں جذبات کی آگ نہیں بھڑکاتی۔ چنانچہ نئی تعلیم کے معصوم بندے یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ شاعری کی وقعت کا دارومدار محض خیالات کی بلندی و پاکیزگی پر ہے۔ انگریزی نظموں میں آزادی وحب الوطنی کے خیالات دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ اردو شاعری میں انھیں اس قسم کے خیالات کا پتہ نہیں ملتا لہذا اس کے مطالعے کا بار ان کی نگاہیں نہیں اٹھا سکتیں۔

نفس شاعری کے جوہر لطیف کا زبان یا قلم کی مدد سے خاکہ کھینچنا دشوار ہے۔ یہ ویسا ہے کہ سریلی آواز کے سننے سے یا دریا کی لہروں پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کی دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری و زبان کے جادو کی تشریح و تعریف زبان و قلم کے اختیار سے باہر ہے۔ بقول شاعر

بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زبان دل کے لیے ہے نہ دل زبان کے لیے

مگر بادی النظر میں شاعری کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق خیالات سے ہے' دوسرے کا زبان سے ہے' جس کو خیالات کا پیرہن یا لباس سمجھنا چاہیے۔ خیالات کا اظہار پاکیزہ اور سلیس نثر میں بھی لطافت کے ساتھ ہو سکتا ہے مگر شاعر کے خیالات دلی جذبات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلتے ہیں اور زبان میں خاص تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔ شاعرانہ خیالات کے پھولوں کی نشو و نما محض دماغ کی پھلواری تک محدود نہیں رہتی ہے۔ شاعر کے دلی جذبات کی برقی حرارت ان پھولوں کا عطر کھینچ لیتی ہے۔ اسی کا نام شاعرانہ تاثیر و لطافت ہے۔ اس شاعرانہ لطافت و تاثیر کے عام کرنے کا ذریعہ شاعرانہ زبان ہے۔ شاعر

بھی وہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس کے ہم وطنوں کی زبان پر ہوتے ہیں مگر انھیں الفاظ کی الٹ پھیر سے وہ اپنے بیان میں عالم تصویر پیدا کر دیتا ہے اور محض عالم تصویر ہی نہیں پیدا کر دیتا ہے بلکہ اس کے الفاظ میں ایک راگ کی تاثیر نمایاں ہو جاتی ہے جو فن موسیقی کی راگ راگنی سے الگ ہے۔ اگر انگریزی شاعری کو اس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات مغربی نظم کے پڑھنے سے دماغی حظ ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن نہ انداز کلام کی شاعرانہ لطافت ان کے دلوں میں برقی حرارت پیدا کرتی ہے، نہ زبان کی مصوری کا انھیں حس ہوتا ہے، نہ الفاظ کا راگ ان کے کانوں کی فضا میں سماتا ہے۔ ان کا دماغ یہ خوب پہچان لیتا ہے کہ کس قسم کے خیالات نظم کیے گئے ہیں مگر ان کا دل جسے جذبات کا ذخیرہ خیال کرنا چاہیے یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان خیالات کے ادا کرنے کا شاعرانہ انداز کیا ہے۔ ان کے کان یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر نے معمولی الفاظ میں کیا جادو بھر دیا ہے۔

ایسا ہونا ایک حد تک لازمی ہے۔ جس زبان میں انگریزی شاعری ہے اس زبان کے الفاظ سے ہمارے کان قدرتی طور سے غیر مانوس ہیں۔ ان کا قدرتی نغمہ ہمارے لیے خلق نہیں ہوا تھا۔ جس تہذیب کے عالم میں مغربی شاعروں کے رنج وراحت کے جذبات نے نشو و نما پائی، ہماری سوسائٹی کی دنیا اس سے دور اور الگ ہے۔ مغربی دنیا کے قدیم مذہبی اور قومی کارنامے جو وہاں کے سورماؤں اور پیمبران دین کی ذات کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کی بدولت وہاں کے اکثر دریا یا پہاڑ یا اکثر قدرتی منظر قومی شاعری کے لیے سرمایہ ناز ہو گئے ہیں، ہمارے دلوں میں تاثیر کی گرمی نہیں پیدا کر سکتے۔ ایسی حالت میں مغربی نظم کے اصلی شاعرانہ پہلو کا اندازہ کرنا جس کا تعلق خاص جذبات سے ہے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

ممکن ہے چند ایسے ارباب وطن ہوں جنھوں نے انگلستان کی بود و باش کی وجہ سے اور قدرتی ذہانت کے صدقے میں مغربی سوسائٹی کے قومی و مذہبی خیالات و جذبات کا رنگ پورے طور سے پہچان لیا ہو اور جنھوں نے انگریزی زبان پر ایسا عبور حاصل کر لیا ہو کہ انھیں اس ساز کے تمام پردوں سے واقفیت حاصل ہو گئی ہو۔ ایسے حضرات انگریزی نظم کی شاعرانہ لطافت سے ضرور حظ اٹھا سکتے ہیں، مگر عام طور سے شیکسپیر و ملٹن کی جو

ثنا و صفت، انگریزی داں نوجوانوں کی زبان سے سننے میں آتی ہے وہ بہت کچھ فرہنگوں کی بدولت ہوا کرتی ہے۔ میر تقی میر جب دہلی سے لکھنو آئے تو یہاں کے چند بزرگ ان سے ملنے گئے اور کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے کہا کہ آپ حضرات میرا کلام سمجھ نہیں سکتے۔ بے چارے اپنا طیش ضبط نہ کر سکے اور کہہ اٹھے کہ جناب ہم فردوسی ونظامی کا کلام سمجھ سکتے ہیں مگر آپ کا کلام ایسا ہے کہ اس کی قدر دانی ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ فردوسی ونظامی کے کلام کی فرہنگیں چھپ گئی ہیں مگر میرے کلام کی ابھی کوئی فرہنگ نہیں چھپی ہے اس لیے آپ اس کی خوبی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ عام طور سے انگریزی نظم کے قدر دانوں کی حالت اس سے زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ فرہنگ کے مطالعے سے شیکسپیر کے کلام پر وجد کرنا سیکھ لیں مگر وہ اس قدر دانی کے جذبے کا اندازہ نہیں کر سکتے جس نے کارلائل کو یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ اگر اس سے پوچھا جائے کہ اسے ہندستان کی سلطنت زیادہ عزیز ہے کہ شیکسپیر تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ چاہے ہندستان کی سلطنت نکل جائے مگر انگریزی قوم شیکسپیر کا دامن نہیں چھوڑ سکتی۔

عبدالحلیم شرؔر

اچھوتا پن

آغاز جوانی میں ادا اور ہی کچھ ہے
اٹھتی ہوئی کونپل میں مزہ اور ہی کچھ ہے

اے دنیا کے پُر تکلف باغو' اور نظر فریب گلستانو۔ تمھاری آراستگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی' تمھیں سرسبز وشاداب بناتے' تمھارے پھولوں کو نظر فریب ترتیبوں سے سجنے اور تمھارے پودوں کی رونق بڑھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی' پھر بھی تم میں وہ دل کشی نظر فریبی اور وہ زیبائی و رعنائی نہیں جو ان غیر قابل گزر پہاڑوں کے قدرتی اور خودرو بیل بوٹوں میں ہے' جہاں انسان کا گزر نہیں ہوا' جہاں کے پودوں میں انسان کا ہاتھ نہیں لگا' جہاں کے پھولوں تک کسی گلچیں کی رسائی نہیں ہوئی اور جن کی روح افزا مہک ابھی کسی کے دماغ سے آشنا نہیں ہونے پائی' اس میں کیا راز ہے کہ تم گو ہمارے پاس اور ہم سے قریب موجود ہو' ہماری دل ربائی کے لیے تم اچھی طرح نکھر بھی گئے ہو' جو لوگ شاہدانِ چمن کی مشاطہ گری کیا کرتے ہیں' انھوں نے ہر طرح کی تدبیروں اور کوششوں سے تمھیں بناچنا کے خوب سنوار بھی دیا اور تم میں ہر قسم کے لطف بھی پیدا کردیے۔ ہمارا خیال ہمیشہ ہمالیہ کی ان پیچیدہ اور دشوار گزار گھاٹیوں ہی میں گھسنے کی کوشش کیا کرتا ہے جہاں تک ابھی انسان کا قدم نہیں گیا اور جہاں کے گل بوٹے ابھی کسی کی نظر سے نہیں گزرے۔ آخر یہ کیوں ہے؟ اور ہم ان سامنے کے حسنوں اور پیش پا افتادہ خوشنمائیوں کو چھوڑ کے ان خیالی...... تصویروں کے کیوں اس قدر والہ وشیدا ہو رہے ہیں؟ محض اس لیے کہ وہ ابھی "اچھوتے ہیں' انھیں کسی کا ہاتھ نہیں لگا' کسی کی نگاہ شوق ان تک نہیں پہنچی' اور نہ کسی اور لطف اٹھانے والے نے لذت اٹھا کے انھیں جھوٹا کیا۔"

خلاصہ یہ کہ قدرت نے ان کی خوبیوں اور لذتوں پر جو مہر لگائی ہے، وہ ابھی تک نہیں ٹوٹی اور ان کا کوراپن یہ دلکش جملے کہہ کہہ کے ہمیں لالچ دلا رہا ہے کہ "لا عین رأت و اذان سمعت" تم دیکھتے ہو کہ آبدار موتی یا جلادار آئینہ کسی کا ہاتھ چھو جاتے ہی ماند اور دھندلا ہو جاتا ہے۔ اور چھوئی موئی کی نازک پتیوں کو ہماری ہوا بھی لگتی ہے تو مرجھا جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ زیبائی اور رعنائی کا لطف و مزہ بھی لوٹنے والوں کی دست برد سے پھیکا پڑ جاتا ہے۔ خوشبودار پھولوں کو لوگ اس بے رحمی سے سونگھتے ہیں کہ سونگھتے ہی سونگھتے ان کی خوشبو مٹا دیتے ہیں اور خوبصورت و شاداب پھولوں یعنی شاہدان چمن کے حسن و جمال کو پُر شوق نگاہیں کچھ ایسی تیزی سے گھورتی ہیں کہ گھورتے ہی گھورتے ان کے حسن کو پھیکا کر دیتی ہیں۔ بے باک دست شوق، حسن کے لاکھوں بناؤ کو ایک گھڑی میں بگاڑ کے رکھ دیتے ہیں اور باغ حسن کے گلچیں جس خوشنمائی کی طرف رخ کرتے ہیں اسے پھر اپنے بعد کسی اور کے لیے نہیں چھوڑتے۔ سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے لطف اٹھانا نام ہی اس چیز کا ہے کہ حسن کی دولت لوٹ لی جائے اور اس کی خوبیاں اگر مٹائے نہ مٹ سکیں تو بھی ماند اور پھیکی کر دی جائیں۔

اور اسی سبب سے اچھا ذوق رکھنے والا، اسی پھل کو ڈھونڈھتا ہے جو ڈال کا ٹوٹا ہوا ہو، میکش دل کی لگی بجھانے کے لیے اسی شراب کو مانگ رہا ہے جو اچھوتی ہے۔ عقیدت کیش اپنے دیوتاؤں پر چڑھانے کے لیے اچھوتا پھول تلاش کرتا ہے۔ نازک خیال شاعر کسی اچھوتے خیال کی جستجو میں ہے۔ رخ زیبا کا دلدادہ کسی کورے پنڈے والی کی اچھوتی صورت کا دیوانہ ہے اور اچھی غذاؤں کا شوقین اس غذا کا رسیا ہے جس میں کسی نئی لذت کی وجہ سے اچھوتے پن کی شان پیدا ہو گئی ہو۔

فی الحقیقت اچھوتا ہو نادر کنار، پرانے لطف جن سے مزہ اٹھایا جا چکا اور برتے ہوئے حسن جن سے لذت حاصل کی جا چکی ہو، وہ بھی جب کسی نئی شان ...... اور نئی آن بان سے نمودار ہوتے ہیں، تو ان میں ایک خاص قسم کا ایسا لطف ہوتا ہے جو اور کبھی نہیں نصیب ہو سکتا۔ روز کے آنے والے مہمانان شب جب کسی نئی وضع اور نئے بانکپن کی ادا دکھاتے ہوئے آ جاتے ہیں تو ہماری بے تابیاں معمول سے بدرجہا زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ باغوں اور صحراؤں کی سیر کرتے کرتے اگر کوئی نئی وضع کا پھول نظر کے سامنے آ جاتا ہے تو ہم

معمول سے کہیں زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

وہ نظر فریب جلوہ جو نظر سے نہیں گزرا، وہ دلکش رسیلی آواز جو ابھی کانوں سے آشنا نہیں ہوئی، اسی طرح ہر لذت و مسرت کی چیز جس کو ہماری حس نے ابھی محسوس نہیں کیا، غور سے دیکھیے تو اپنی جگہ پر اچھوتی ہے اور اسی سبب سے اس میں لطف بھی بدرجہا زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

فردوس بریں کے ہم حد سے زیادہ دلدادہ ہیں۔ وہاں کی لذتوں کا خیال اور وہاں کی حوروں کا حسن و جمال جب یاد دلایا جاتا ہے تو ہم میں ایک عجیب محویت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیوں؟ محض اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہاں کی ہر چیز اچھوتی ہوتی ہے۔ نہ وہاں کے پھولوں کو کسی نے دیکھا نہ، وہاں کے پھلوں کو کسی نے چکھا۔ نہ وہاں کے دلکش نغمے کسی کے گوش زد ہوئے اور نہ وہاں کی مہ طلعت کنواریوں تک کوئی اپنا دست شوق دراز کر سکا۔ بس اچھوتا پن ہے جو ہمیں اس ملاء اعلا کے شوق میں بے تاب کیے ہوئے ہے۔ کہتے ہیں کہ شداد کی جنت اس دنیا میں ایک غیر معمولی زیب و زینت کے ساتھ آراستہ کی گئی تھی مگر تیار ہوتے ہی دنیا سے غائب اور اس ملاء اعلا کی جنت میں شامل کر لی گئی۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا بھی غالباً یہی سبب تھا کہ شداد نے اس سے لطف اٹھانا اس وقت تک ملتوی رکھا تھا جب وہ بن کے تیار اور آراستہ ہو جائے مگر تیاری کے بعد ہنوز اس سے کوئی لطف نہیں اٹھانے پایا تھا کہ یکایک نظروں سے غائب ہو گئی اور ویسی ہی اچھوتی بنی رہی۔

آسمان کے یہ خوبصورت اور روشن تارے جو اپنے دور کے منظر سے نہایت ہی حسین و خوشنما معلوم ہوتے ہیں جن میں انسان کبھی مذہبی عقیدت سے طرح طرح کے کرشمے مانتا ہے اور کبھی انھیں اپنی صحبت ہائے عیش کی جان تسلیم کرتا ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو ان کی اصلی خوبی صرف یہ ہے کہ وہ ایک ایسے مامن میں ہیں جہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی اور ہر ایک کے دستِ شوق سے بچے رہنے کے سبب سے اچھوتے ہیں۔ ان کی روشن اور آب دار سطح میں کسی کا ہاتھ نہیں لگا کہ انھیں میلا اور ماند کرتا۔ موجودہ علم ہئیات بتا رہا ہے کہ ان میں روشنی و درخشانی خاک نہیں یہ صرف آفتاب کی کرنیں ہیں جو انھیں چمکا رہی ہیں۔ اصل میں وہ بھی ہمارے ہی کرۂ ارض کے ایسے کرّے ہیں جن میں ایسے ہی پہاڑ ہیں اور ایسے ہی سمندر، ایسے ہی جنگل ہیں اور ایسے ہی پیڑ۔ ہم مانے لیتے ہیں

کہ ایسا ہی ہے مگر اب بھی اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اچھوتے ہیں۔ ان کے جمال جہاں آرا کو کوئی پاس سے جا کے نہیں دیکھ سکتا۔ ہماری دنیا والوں میں سے نہ کسی کا ہاتھ ان تک پہنچا ہے اور نہ کسی کا نقش قدم ان کی اس سطح پر بنا ہے جو دور سے ہمیں عجب لطف دکھایا کرتی ہے۔

حضرت رسالت (صلعم) کا معمول تھا کہ مینہہ برسنے لگتا تو آپ اس کی بوندوں کو اپنے جسم مبارک پر لیتے اور فرماتے "جدیت عہد بربنا" (ہمارے پروردگار کے پاس سے نیا نیا چلا آتا ہے) اور واقعی خیال فرمایئے کہ چونکہ مینہہ میں اعلادرجہ کا اچھوتا پن ہوتا ہے ہمارا ہاتھ کیا معنی ہماری ہوا تک اسے نہیں لگی ہوتی ہے۔ لہٰذا کس قدر عزیز ہوتا ہے۔ قطع نظر ان فائدوں کے جو دنیا کو اس سے حاصل ہوتے ہیں ہم اس سے لطف کیسے اٹھاتے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ دنیا میں اگر مزہ ہے تو اسی چیز میں جس میں کچھ اچھوتا پن بھی پایا جاتا ہے۔ وہ ناپید اکنار ریگستان جہاں تشنگی انسان کو موت کا آرزومند کر دیتی ہے وہاں بھی اگر اس جانب خیال جاتا ہے کہ دامن ریگ پر کسی انسان کا نقش قدم نہیں پڑا اور اس جگہ تک ہم سے پہلے کسی کا گزر نہیں ہوا تو اس مصیبت میں بھی دو گھڑی کو کچھ مزہ سا آجاتا ہے۔

یہی شوق ہے جو موجودہ سیاحوں کو باوجود اطمینان و فارغ البالی کے ایک جگہ نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ ہزارہا حوصلے والے قطب شمالی کی سرزمین کا سماں دیکھنے کے لیے جاتے ہیں اور برف و سردی میں مبتلا ہو کے جان دیتے یا مرتے مرتے بچتے ہیں۔ انھیں کس چیز کا شوق اس غیر آباد اور غیر ممکن السیر حصہ زمین کی طرف لے جاتا ہے۔ صرف یہ کہ دنیا بھر میں اگر کوئی قطعہ ارض قطعاً اور یقیناً اچھوتا ہے' تو وہی ہے۔ آج تک نہ وہاں کسی کی رسائی ہوئی اور نہ کسی کو اس جاں ستاں برف کی زمین اور ان روح فرسا برف کے پہاڑوں کی طرف قدم بڑھانے کی جرات ہوئی۔ بس اس مقام میں اور وہاں کے نئے منظر کا اچھوتا پن ہے جو لوگوں کو اُدھر کھینچ رہا ہے۔

اسی اچھوتے پن کی دلچسپی نے ہمارے ہندو دوستوں میں چھوت کا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ بہ ظاہر تنگ خیالی اور معاشرت کی غیر قابل برداشت دشواری نظر آتی ہے کہ کسی نے چوکے میں پاؤں رکھا اور وہ چھوت ہو گیا۔ کسی نے کسی برتن کو ہاتھ لگایا اور وہ گیا گزرا ہوا۔ کسی کھانے کی چیز تک کسی کا ہاتھ پہنچا اور وہ ناپاک ہو گئی' مگر سچ یہ ہے کہ انھیں قیدوں

کی بدولت وہ ہر چیز میں اچھوتے پن کا مزہ پاتے ہیں اور معاشرت کے ہر کام میں تازگی اور جدت کا لطف اٹھالیا کرتے ہیں۔ کوہ قاف کے دامن میں رہنے والے سمجھتے تھے کہ اس عظیم الشان کوہستان کی ایک ایسی گھاٹی میں جہاں کسی کا گزر نہیں ہوا، ایک دنیاوی جنت ہے جس کی مسرتوں سے وہی لطف اٹھا سکتا ہے جس کا وہاں تک گزر ہو جائے اور سچے فطرت پرست ہندو معتقد تھے کہ جنت ہمالیہ کی برف آلود چوٹیوں کے پاس ہے۔ انھیں پر منحصر نہیں انسان کی فطرت ایسی ہی واقع ہوئی ہے کہ جس مقام تک اس کی رسائی نہ ہو سکے اسے اپنے خیال میں وہ ہر قسم کی لذتوں اور ہر طرح کی نعمتوں کا لازوال خزانہ تصور کرتا ہے۔ مگر یہ سب اسی سبب سے ہے کہ وہ مقامات اس کے نزدیک اچھوتے ہیں اور وہاں کی لذتوں سے ابھی تک کوئی لطف نہیں اٹھا سکا ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو یہ اس اچھوتے پن ہی کا شوق ہے جو انسان کو عموماً سفر کا شائق بناتا ہے اور اولوالعزم سیاحوں سے دنیا کے ایک ایک کونے کی خاک چھنوادیتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری

ادب اور زندگی

ادب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا اور ادب ترک یا تپسّیا کی پیداوار نہیں ہے۔ادیب بھی اسی طرح ایک مخصوص ہیئت اجتماعی'ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے جس طرح کہ کوئی دوسرا افرد'اور ادب بھی براہ راست ہماری سماجی اور معاشی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے'جس طرح ہمارے دوسرے حرکات وسکنات۔ ادیب کو خلاق کہا گیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ وہ قادر مطلق کی طرح صرف ایک "کن" سے جو جی چاہے اور جس وقت چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے اس میں شک نہیں کہ ایک اندرونی اپج سے مجبور ہو کر کہتا ہے جو بظاہر انفرادی چیز معلوم ہوتی ہے' لیکن دراصل یہ اپج ان تمام خارجی حالات واسباب کا نتیجہ ہوتی ہے جس کو مجموعی طور پر ہیئت اجتماعی کہتے ہیں۔ شاعر کی زبان الہامی زبان مانی گئی ہے۔ مگر یہ الہامی زبان درپردہ زمانہ اور ماحول کی زبان ہوتی ہے'اگر ایسا نہ ہوتا تو تاریخ ادب کی اصطلاح کے کوئی معنی نہ ہوتے۔ جرمنی کے مشہور فلسفی ہیگل نے فلسفے کو تاریخ مانا ہے۔ یعنی فلسفہ نام انسان کے خیالات وافکار کے آگے بڑھتے رہنے اور زمانہ کے ساتھ بدلتے رہنے کا'اسی طرح ادب کی تاریخ ہے جس میں کسی ملک یا کسی قوم کے دور بہ دور بدلتے ہوئے تمدّن کی مسلسل تصویریں نظر آتی ہیں۔ البتہ اس کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔ فنون لطیفہ بالخصوص ادبیات کسی نہ کسی حد تک قوموں کے عروج وزوال کا آئینہ ضرور ہوتے ہیں......

ایمرسن کہتا ہے کہ ہر دور کو خود اپنا قومی ادب (Classics) پیدا کرنا چاہیے یعنی ہر ادبی کارنامے میں عصری میلانات وخصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ آج محض حسن کاری کو ادب کہتے ہیں۔ ادب اگر ملک اور زمانے کے تازہ ترین فکریات یعنی اجتماعی خیالات

وافکار کا حاصل نہیں ہے تو وہ صحیح معنوں میں ادب نہیں ہے۔ اب یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ حسن، خیر اور حقیقت تینوں کو ایک آہنگ بنا کر پیش کرنے کا نام ادب ہے اور سب سے بڑا ادیب وہ ہے جو بیک وقت ہمارے ذوق حسن، ذوق فکر اور ذوق عمل کو نہ صرف آسودہ کرے بلکہ حرکت میں لائے، اب خیال، حسن اور عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ادبیات کو بے غرض وغایت ہوتے ہوئے بھی غایتی ہونا ہے۔ اس کے اندر ایک دبے ہوئے غایتی میلان کا ہونا لازمی ہے۔

میر وغالب اپنے اپنے وقت سے پہلے یا بعد میں نہیں پیدا ہوئے۔ دلی کی شاعری اپنے دور کے بعد لکھنو میں رواج نہ پا سکی یا لکھنوی شاعری اپنے وقت سے پہلے دلی میں نہ جنم لے سکی۔ یہ سب محض اتفاقی امور نہیں ہیں بلکہ تاریخی تقدیریں ہیں۔ جس طرح ہر چیز، تاریخ یعنی زمانے سے مجبور ہے اسی طرح ادب سے بھی مجبور ہے...... تاریخی جبریت کچھ اقتصادیات اور عمرانیات کا قانون نہیں ہے۔ ادبیات کی دنیا میں بھی قدرت کا یہی اٹل قانون جاری ہے یعنی کوئی ادبی پیداوار نہ وقت سے پہلے ہوئی ہے نہ وقت کے بعد، اگر ہوئی تو وہ شاہکار تسلیم نہیں کی جائے گی اور نہ اس کا تاریخ میں کوئی نام ہوگا۔!

دنیا کے ادبیات کا اگر تاریخی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت دن کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ زندگی کے اور شعبوں کی طرح ادب بھی ان ہی حالات واسباب کا نتیجہ ہے جن کو مجموعی طور پر ہیئت اجتماعی یا نظام معاشرت کہتے ہیں۔ ادب انسان کے جذبات وخیالات کا ترجمان ہے اور انسان کے خیالات وجذبات تابع ہوتے ہیں زمانے اور ماحول کے۔ جیسا دور اور جیسی معاشرت ہوگی ویسے ہی جذبات وخیالات ہوں گے اور پھر ویسا ہی ادب ہوگا۔

اس وقت دنیائے انسانیت کے پاس کوئی تہذیب نہیں ہے۔ موجودہ دور کی سب سے زیادہ نمایاں اور محسوس خصوصیت انتشار اور پراگندگی ہے۔ نہ کوئی ایک تخیل ہے، نہ کوئی ایک میلان اور نہ کوئی ایک معیار اور کہنے کے لیے بے شمار میلانات ہیں جو مختلف اور متضاد سمتوں میں بکھر رہے ہیں۔ یہ انتشار اور ہیجان آج کل کے ادب میں بھی جھلک رہا ہے۔ ہر ادیب اپنی راہ جاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی شدید قسم کی انفرادیت میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ کوئی اشتراکیت کی پکار لگا رہا ہے۔ کوئی ہمارے غیر شعوری نفسیات کا جائزہ لے رہا ہے،

کوئی سماجی اور معاشی تدبیریں بجھا رہا ہے۔ کوئی قومیت اور جمہوریت کا نعرہ بلند کر رہا ہے' کوئی یوٹوپیا کا خواب دیکھ رہا ہے اور ایک آفاقی سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے۔ نقادوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ ادیب کا کام یہ ہے کہ اپنی شخصیت کو دبا کر خود اپنے کو خارجی حقیقت کا ایک جزو بنائے' دوسری جماعت کہتی ہے کہ واہ یہی شخصیت اور یہی انفرادیت تو حاصل ادب ہے' غرض کہ جتنے دماغ اتنے خیالات اور جتنے منہ اتنی باتیں۔ ان تمام میلانات اور تحریکات میں دو زیادہ اہم اور عالمگیر ہیں۔ یہ فاشزم (Fascism) اور اشتراکیت (Communism) ہیں اور دونوں پرانے بتوں کو توڑنے پر تلی ہوئی ہیں۔ جن ملکوں میں سرمایہ داری نے اپنے کو بچانے کے لیے فاشی آمریت (FASCIST DICTATORSHIP) کا بھیس اختیار کر لیا ہے ان میں تو سمجھیے کہ ادب مر چکا ہے۔ اس لیے کہ اس کا خیال ہے کہ ''ذہنی اور دماغی زندگی قوم کے لیے سم قاتل ہے۔'' ہٹلر صاف کہتا ہے کہ ادب عزلت نشیں اور کاہل سپاہی پاشیوں کا ابلا ہوا پھین ہے۔'' اس کی نگاہ میں ادب صرف تعیش اور تفریح کی چیز ہے۔

لیکن دوسری جماعت سنجیدگی سے ادب کا جائزہ لے رہی ہے اور نئے اصول تنقید مرتب کر کے ایک بالکل نئے ادب کی تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ اس کے خیال میں ادب کو صرف ایک منتخب اور مخصوص جماعت کی زندگی کا آئینہ نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ جمہوری ذہنیت کی تصویر اور جمہوری زندگی کا حامی ہونا چاہیے۔ اشتراکیوں کی جو کانگریس ۱۹۳۲ میں خارکاف میں ہوئی تھی اس میں کھلے الفاظ میں یہ طے پایا تھا کہ ادب کو جماعت کی خدمت میں ایک آلۂ کار ہونا چاہیے اور اس کا کام تبلیغ و تنظیم ہو۔

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ادب آئینہ ہے زندگی کا' اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کی صحیح تعریف کیا ہے۔ زندگی اور ادب میں جو تعلق ہے کس قسم کا ہے اور زندگی میں امتیاز کیا ہے' کیا ادب کے معنی صرف زندگی کی تکرار یا نقل کے ہیں۔ اگر زندگی کے محض اعادہ یا مثنیٰ کو ادب کہتے ہیں تو پھر اصل اور مثنیٰ میں کیا فرق ہے' اور اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔

ادب یا حسن کاری اگر زندگی کی محض ایک سادہ نقل ہے تو یقیناً ایک فعل عبث ہے جو زیادہ سے زیادہ تفریح کا سبب بن سکتا ہے اور اگر افلاطون نے اسے جمہوریت سے خارج

کر دیا تو کچھ برا نہیں کیا۔ سب سے پہلے جس نے ادب کی معقول تعریف کی اور ادب اور زندگی میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی وہ میتھو آرنلڈ تھا۔ ادب کی جو اس نے تعریف کی ہے وہ آج تک ضرب المثل ہے۔ اس نے ادب کو زندگی کی تنقید بتایا ہے۔ یہ تعریف اگرچہ مبہم ہے لیکن ہے بہت گہری اور اس جدید میلان کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس نے اسی زمانے میں کارل مارکس سے "اشتراکی اعلان" لکھوایا۔ اسی زمانے میں حسن کاری برائے حسن کاری یا "ادب برائے ادب" کا خاص جمالیاتی نظریہ بھی وجود میں آیا جس کی ابتداء کیٹس سے ہوتی ہے۔ کیٹس کو ایسی شاعری سے نفرت تھی جو کوئی مخصوص غایت یا خاص مقصد پیش نظر رکھتی ہو۔ اس کے لیے حسین چیز بجائے خود ایک ابدی مسرت تھی۔ وہ کہتا ہے کہ "حسن حقیقت ہے اور حقیقت حسن' بس اتنی ہی سی بات ہے اور ہم کو اسی قدر جاننے کی ضرورت ہے" اس کے بعد یورپ کے بڑے بڑے نقادوں نے اس خیال کی حمایت اور اشاعت کی' سب نے ایک آواز ہو کر یہی کہا کہ حسن مقصود بالذات ہے اور نیکی اور بدی کے حدود سے بالکل باہر ہے۔ شعر و ادب کا کام ہمارے اندر حسن کا احساس پیدا کرنا اور اس کو قائم رکھنا ہے۔ یہ احساس حسن ہماری ابدی مسرت کی ضمانت ہے۔ زندگی میں جتنی کریہہ اور بد صورت چیزیں ہیں ان کو بھی حسین بنا دینے کا نام "حسن کاری" ہے والٹر پیٹر کا اصرار ہے کہ ادب کی غایت سوا لذت و انبساط کے اور کچھ نہیں۔ آج کل اٹلی کا مشہور فلسفی' ماہر جمالیات کروچے اسی ماورائی نظریے کا علم بردار ہے۔ اس کے خیال میں حسن کاری یعنی آرٹ ایک وجدانی تجربہ ہے جو آپ اپنی غایت ہے اور جس کو منطق و فلسفہ یا مذہب و اخلاق کے اصول سے نہیں جانچا جا سکتا۔

خالص تخئیلیت انسانی معاشرت کے لیے خطرات سے خالی نہیں۔ بدی کو نیکی' جھوٹ کو سچ' بد صورتی کو حسن' غم کو راحت بنانے کی عادت جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو بیماری ہو جاتی ہے اور انسان اس کے ہاتھوں کاہلی' تعیش اور مجہولیت کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تخئیلیت نے اگر دنیائے واقعات سے منہ پھیر لیا تو وہ دنیائے انسانیت کی تہذیب و تحسین میں کوئی حصہ نہ لے سکے گی۔

پریم چند

کفن

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق' سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا' جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی' دیکھ کر کیا آؤں؟" "تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا دکھ بھوگا۔ اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی؟"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام' گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام' مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹا بھر کام کرتا تو گھنٹا بھر چلم پیتا۔ اس لیے انھیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے' جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی' کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کے لیے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ

ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی، عجب زندگی تھی ان کی، گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں، پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے، دنیا کے مکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے گالیاں بھی کھاتے تھے۔ مگر کوئی غم نہیں، مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے، اور راتوں کو چوستے، گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی، جب سے یہ عورت آئی تھی، اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام بھی کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ ''جا کر دیکھ تو کیا حال ہے...... (اس کی؟)'' چڑیل کا پھساد ہو گا۔ اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیا مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟''

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا۔ ''مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔''

''ڈر کس بات کا ہے، میں تو یہاں ہوں ہی۔''

''تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔''

''میری عورت جب مرتی تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں، کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا، آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں، اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہو گی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے

گی۔"

"میں سوچتا ہوں کوئی بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا' سونٹھ' گڑ' تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آجائے گا' بھگوان بچہ تو دیں۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے' میرے تو نو لڑکے ہوئے' گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے' کہیں زیادہ فارغ البال تھے' وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بیں تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی بھی کرتا اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے' اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے گاؤں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے' کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں' چھل جانے پر آلو کے بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔ اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے' وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھا اس لیے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے' حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا

اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں' سب کو۔ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی سپٹنی رائتا' تین طرح کے سوکھے ساگ' ایک رسے دار ترکاری' دہی' چٹنی' مٹھائی' اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ' لوگوں نے تو ایسا کھایا' ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے تھا مگر وہ ہیں کہ دیے جارہے ہیں اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔ کھڑا ہوا نہ جاتا تھا۔ چٹ پٹ جاکر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اب تو سب کو کپھایت سوجھی ہے۔ سادی بیاہ میں مت خرچ کرو' کریا کرم میں مت خرچ کرو' پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے مگر بٹورنے میں کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھاجاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی' اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھاکر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پانو پیٹ میں ڈالے سو رہے جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں۔ اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جاکر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں' سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا......!

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا' پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم

کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا' کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی' گھر میں تو پیسا اسی طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں مانس..... !

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے۔ چوری کی علت میں' وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں' پوچھا.....

"کیا ہے بے گھیسوا روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر' آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

"سرکار بڑی بپت میں ہوں' مادھو کی گھروالی رات گجر گئی' دن بھر تڑپتی رہی سرکار' آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے' دوا دارو جو کچھ ہو سکا' سب کیا مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک تباہ ہوگئے' گھر اُجڑ گیا' آپ کا گلام ہوں' اب آپ کے سوا اس کی مٹی پار کون لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہوگی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں.....؟"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہ کہہ دیں۔ "چل دور ہو یہاں سے' لاش گھر میں رکھ سڑا' یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے حرام خور کہیں کا' بد معاش' مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا۔ طوعاً کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا' اس کی طرف تاکا تک نہیں' گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیے تو گاؤں کے بنیے مہاجنوں کو انکار کی جرات کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا کسی نے دو آنے دیے کسی نے چار آنے' ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دیا' اور کسی نے لکڑی اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔ گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ آکر دیکھتی تھیں اور

اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں!

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ ''لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو۔''

مادھو بولا۔ ''ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کپھن چاہیے۔''

''کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔''

''ہاں اور کیا لاس اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی' رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔''

''کیا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔''

''کپھن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔''

''اور کیا رکھا ہے یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوادارو کرتے۔''

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی' دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی۔ کچھ گزک اور دونوں برآمدہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا۔ ''کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آکھر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔''

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ ''دنیا کا دستور ہے کہ یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں روپے کیوں دے دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔''

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟''

''لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے؟''

گھیسو ہنسا۔ ''کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں''

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر' قدرت کو اس طرح شکست دینے پر' بولا' بڑی اچھی تھی بچاری' مری تو خوب کھلا پلا کر۔''

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی، گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں، گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں، اور تلی ہوئی مچھلیاں، شراب خانے کے سامنے ہی دکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے کر آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انھوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہو گا۔؟"

مادھو نے فرق عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ "جرور سے جردر ہو گا، بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

"کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہ دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمھارا سر۔"

"پوچھے گی تو جرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کپھن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیے؟"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں؟"

"وہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے۔ اور کفن تیسری بار

ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی لہکتا تھا۔ کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ، کتنے تو چلو میں الّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف فراموشی کا مزہ لینے کے لیے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی ہے اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ در گور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر سسکیاں لے رہے تھے، سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا۔ جو کھڑا اُن کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "دینے" کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا کہ "لے جا خوب کھا۔ اور اسیر باد دے، جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، مگر تیرا اسیر باد اسے ضرور پہنچے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بیکنٹھ میں جائے گی دادا، بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ "ہاں بیٹا بیکنٹھ جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی، تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلوّن نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔ مادھو بولا۔ "مگر دادا، بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل

کر۔"

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔ "کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایاجال سے مکت ہو گئی' جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھکاوے ٹھگنی......

سارا مے خانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی' کودے بھی' گرے بھی' مٹکے بھی' بھاؤ بھی بتائے' اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے!

شاہد احمد دہلوی

جگر مراد آبادی

بعض چہرے بڑے دھوکے باز ہوتے ہیں۔

کالا گھٹا ہوا رنگ، اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر الجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ، چہرہ کے رقبے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور منہ کسی قدر بڑا، کثرت پان خوری کے باعث منہ اگالدان، دانت شریفے کے بیج اور لب کلیجی کی دو بوٹیاں، بھرواں کالی ڈاڑھی، ایڈورڈ فیشن کی، سر پر ترکی ٹوپی، بر میں اچکن، آڑا پاجامہ، نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ پاؤں میں پیٹنٹ کی گرگابی، بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قدو قامت کا اٹیچی کیس۔ کوئی بتیس سال ادھر کا ذکر ہے جھانسی میں ایک صاحب سر جھکائے قدم بڑھائے اپنی دھن میں جھومتے چلے جا رہے تھے۔ میرے میزبان نے اشارے سے بتایا "یہ ہیں جگر صاحب" میں نے سنی ان سنی کر دی۔ ہوں گے کوئی، میں نے کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میرے میزبان نے کہا "آج رات مشاعرہ ہے۔ آپ کو لے چلیں گے۔" میں نے کہا۔ کسی اور برے کام میں وقت کیوں نہ ضائع کیا جائے؟ کوئی گویّا ہو تو اس کا گانا سنا جائے۔ وکیل صاحب نے کہا۔ "اس کا بھی انتظام کیا ہے ہم نے، کل ہم آپ کو یہاں کے ایک استاد کا گانا سنوائیں گے، مگر آج آپ مشاعرے میں ضرور چلیے۔ جگر صاحب کا کلام آپ نے غالباً سنا نہیں ہے، سننے کے لائق ہے۔" میں نے جی میں کہا۔ لو بھئی، آج کی رات تو غارت ہوئی۔ قہر درویش بجان درویش، میزبان کی خواہش کا احترام بھی ضروری تھا۔ طوعاً و کرہاً رات کو مشاعرے میں چلنے کی حامی بھر لی۔

پنڈال کشادہ بنایا گیا تھا اور روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اگلی صفوں میں ہمیں جگہ دی گئی۔ مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ وکیل صاحب سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ جھانسی میں آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں اور ان مشاعروں کی جان جگر صاحب

ہوتے ہیں۔ ہر ہر پھر کے جگر صاحب ہی کی تعریف ہوئے جا رہی تھی۔ میں نے وکیل صاحب سے کہا ''یہ تو بتایئے کہ جگر صاحب کون ہیں اور کیا ہیں؟'' انہوں نے مجھے ایسی استعجابی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے کوئی نہایت احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ بولے ''بہت اچھے شاعر ہیں' عینکوں کے ایجنٹ ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اوہو! عینکیں بیچتے ہیں تو یقیناً بہت اچھے شاعر ہوں گے۔'' وکیل صاحب کے چہرے پر خفت کے آثار نمودار ہوئے اور کسی قدر ناگواری کے بھی۔ میں نے اس تکدر کو ٹالنے کے لیے کہا۔ ''اندھوں کو آنکھیں دیتے ہیں' اور کیا چاہیے۔'' وکیل صاحب ہنسنے لگے۔

شعراء کی آمد آمد ہوئی' مشاعرے کے کارکنوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ڈائس پر پہنچا دیا۔ تھوڑی دیر میں جناب صدر بھی تشریف لے آئے۔ ضلع کے حاکم تھے۔ ان کے مسند صدارت سنبھالتے ہی مشاعرہ شروع ہو گیا۔ پہلے چھٹ بھیّوں نے لہک لہک کر اپنا کلام سنایا۔ پھر بیچ کی راس کے شاعروں نے' ان کے بعد جغادریوں نے۔ اتنے میں شور برپا ہوا۔ ''آ گئے جگر صاحب آ گئے۔'' انھیں ڈائس پر پہنچایا گیا اور وہ سلام کر کے جناب صدر کے پہلو میں جا بیٹھے۔ پڑھنے والوں کے چہرے اتر گئے۔ اب جو پڑھنے آتا۔ گھبرایا بولایا آتا اور گھاس سی کاٹ کر چل دیتا۔ جب سب پڑھ چکے تو جناب صدر نے جگر صاحب سے درخواست کی اور سارا پنڈال تالیوں سے گونج گیا۔ جگر صاحب خندۂ دنداں نما کرتے آگے بڑھ آئے۔ وکیل صاحب نے زیر لب فرمایا۔ ''اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی'' میں نے پوچھا۔ ''یہ آپ مجھ سے فرما رہے ہیں یا جگر صاحب سے''؟ وکیل صاحب کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئے۔ جگر صاحب نے گنگنا کر سُر قائم کیا اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سنائی شروع کی۔ مطلع سے مقطع تک غزل کا انداز ہی نیا تھا۔ اس پرخوش گلوئی! پنڈال اڑا کر رکھ دیا۔ کئی کئی دفعہ ایک ایک شعر کو پڑھوایا گیا۔ میں نے جگر سے پہلے اتنا سریلا شاعر اور کوئی نہیں سنایا' پھر گانے والے شاعر سنے تھے جو باقاعدہ تان پلٹے کرتے تھے۔ مثلاً حفیظ' ساغر' روش صدیقی وغیرہ۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ جگر صاحب کا پڑھنا ترنم ہی رہتا تھا' گانا نہیں بنتا تھا۔ جگر صاحب کو اس مشاعرہ میں سن کر میں بھی ان کے مداحوں میں شامل ہو گیا۔

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

میں ۳۱ء یا ۳۲ء میں حیدر آباد گیا تھا۔ واپسی میں دو دن کے لیے سید ابو محمد مرحوم کے ہاں بھوپال میں ٹھہرا تھا۔ سید صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ آپ انھیں یوں پہچانئے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بڑے بھائی تھے۔ جگر صاحب اس زمانے میں بھوپال ہی میں تھے۔ خبر نہیں کہاں سے انھیں معلوم ہوا۔ تیسرے پہر کو مجھ سے ملنے چلے آئے۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بڑے خلوص و محبت سے گلے ملے۔ میری خیریت پوچھی۔ ساقی کی کیفیت دریافت کی۔ خود ہی ساقی کے لیے اپنا کلام بھیجنے کا وعدہ کیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی ایک غزل لکھ کر دی۔ بڑے خوش خط تھے جگر صاحب۔ جو انداز پرانے زمانے کی وصلیوں کا ہوتا ہے۔ اسی انداز میں یہ غزل قلم برداشتہ لکھی تھی مگر موتی جڑ دیے تھے' اختتام پر اپنے نام کا طغرا بنادیا تھا۔ مزاج کی نفاست زبان قلم سے بھی ٹپکتی تھی۔ کتنی خوبصورتی چھپی ہوئی تھی اس ظاہرا بدشکل انسان کے اندر! میری فرمائش پر غزل پڑھ کر بھی سنائی۔ نور کا گلا پایا تھا۔ اندھیرے میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کیا آبِ حیواں کی طرح دنیا کی تمام بیش قیمت اور حسین چیزیں تاریکی ہی میں ہیں؟

میرے ہاں دلّی کے آخری نرت کا استاد اللہ دیے خاں آیا کرتے تھے۔ عمر ستر سے اوپر ہی تھی۔ سوکھ کر چرخ ہوگئے تھے' دانت ٹوٹے ہوئے' گال پچکے ہوئے' بڑی بڑی گھنی سفید مونچھیں' ڈاڑھی منڈی ہوئی مگر بقول مرزا چیونٹیوں کے انڈے موجود رہتے۔ بصورت موجودہ کوئی استاد کو اپنے پاس بٹھانے تک کا روادار نہ ہوتا۔ مگر جب وہ ٹھمری یا دادرے کا کوئی بول لگا کر بتاوا شروع کرتے تو یہ معلوم ہوتا کہ اِندر کے اکھاڑے کی کوئی اپسرا اُتر آئی ہے۔ اسی کریہہ منظر بوڑھے استاد کو گلے لگا لینے کو جی چاہنے لگتا۔ شاید فنکار کا فن ہمیشہ جوان و حسین رہتا ہے اور اس کی خوبصورت روح اس کے بدصورت جسم کی پردہ پوش ہو جاتی ہے۔ جگر صاحب بھی جب اپنا کلام سناتے تو حسین نظر آنے لگتے۔

بھوپال کی مختصر ملاقات کے بعد جگر صاحب سے اکثر ملنا ہوتا رہا۔ ان مختصر ملاقاتوں میں کبھی کبھی شعر و شاعری پر بھی بات چل نکلتی تو جگر صاحب کیٹس اور شیلے تک کے نام لے جاتے۔ باتیں خاصی معقول کرتے تھے۔ اوچھے پن کی حرکتیں نہیں کرتے تھے اور نہ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتے تھے۔ ان کے مزاج کی شایستگی ان کی غزل میں ڈھل گئی تھی۔ ان سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی اور نہ کبھی یہ سنا کہ کسی کو دھوکا دیا' یا کوئی

بیہودہ بات کی۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شریف النفس انسان تھے۔ کارڈینل نیومنؔ نے Gentle Man جنٹل مین کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ کسی کو دکھ نہیں پہنچاتا۔ جگرؔ صاحب ایک Perfect Gentleman تھے۔

نیاز فتح پوری Stunts کے قائل ہیں۔ وہ ہمیشہ چونکانے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً آپ کہیں گے کہ جنت اور دوزخ ہے تو وہ کہیں گے نہیں ہے۔ آپ کہیں گے خدا ہے تو وہ کہیں گے نہیں ہے' آپ کہیں گے قرآن شریف کلام اللہ ہے تو کہیں گے کلام رسولؐ ہے۔ آپ کہیں گے یہ دن ہے تو وہ کہیں گے نہیں رات ہے۔ برنارڈ شاہ کے ایک کردار کی طرح اختلاف ضرور کریں گے۔ اس نے کہا "بیٹھ جاؤ" تو بولا "نہیں' میں کھڑا رہوں گا۔" کہا۔ "اچھا تو کھڑے رہو۔" "نہیں میں بیٹھوں گا۔" یہ کہہ کر بیٹھ گیا' تو اسی سے ملتی جلتی فطرت نیاز صاحب کی ہے۔ حال ہی میں انھوں نے "نگار" کا "جگر نمبر" شائع کیا ہے۔ جگرؔ کے انتقال پر ہندستان اور پاکستان میں بہت سوگ منایا گیا اور کئی رسالوں نے جگر نمبر شائع کیے۔ نیاز صاحب بھلا ٹھنڈے پیٹوں تعریف و توصیف کے اس پشتارے کو کیسے گوارا کر لیتے چنانچہ انھوں نے بھی ایک جگر نمبر شائع کر دیا جس میں سوائے جگر کی برائی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس نمبر کا حشر تو وہی ہوگا جو آسمان پر تھوکنے کا۔ مجھے یہاں ایک واقعہ کی وضاحت کرنی ہے جو اس نمبر میں درج کیا گیا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کراچی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت کے لیے جناب نیاز کو لکھنو سے بلوایا گیا تھا۔ کس نے بلایا تھا اور کیوں بلایا تھا؟ اس کو اس وقت چھوڑیے' نیاز صاحب نے لکھا ہے کہ انھیں کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جگر صاحب کراچی میں موجود ہیں مگر انھوں نے نیاز صاحب کی صدارت میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ نیاز صاحب نے جگرؔ کے انکار کی وجہ ان تنقیدوں کو قرار دیا جو کبھی "نگار" میں انھوں نے کلام جگر پر لکھی تھیں مگر ہوا یہ کہ جگر صاحب مشاعرے میں آئے اور انھوں نے کلام بھی سنایا۔ اس واقعہ کو لکھ کر نیاز صاحب نے بتایا ہے کہ جگر چونکہ پیسے لے کر پڑھتے تھے اس لیے وہ مشاعرے میں شرکت پر مجبور تھے۔ پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ پیسے لے کر پڑھنے والے شاعر کا کلام پھسپھسا ہوتا ہے۔ اسی مفروضہ پر نیاز صاحب نے اپنی دانست میں اس خاص نمبر میں کلام جگر کے بخیے ادھیڑ دیے ہیں مگر جب آپ ان کے اعتراضات پڑھیں گے

تو آپ کو اس بوڑھے علامہ کے بچکانہ اعتراضات پر ہنسی آنے لگے گی۔ خیر یہ ایک الگ لغویت ہے جس سے محظوظ ہونے کے لیے اگر آپ وقت نکال سکتے ہوں تو نکال لیجیے۔ ہمیں تو صرف اس مشاعرے والے واقعہ سے سروکار ہے۔ جگر اتنے چھوٹے دل کے آدمی نہیں تھے کہ نیاز صاحب کی تنقید سے چراغ پا ہو جاتے اور سالہا سال تک ان سے دل میں بغض رکھتے۔ جگر صاحب کا ساری عمر یہ عمل رہا کہ اپنے بدخواہوں کو معاف کر دیتے تھے۔ ان کے نزدیک یہی سب سے بڑی سزا تھی۔ اس کے علاوہ اخلاقی اعتبار سے جگر صاحب اتنے گرے ہوئے بھی نہیں تھے کہ کراچی کا مشاعرہ نہ پڑھتے تو ان کے ہاں فاقے پڑ جاتے۔ جگر صاحب کراچی آکر مہینوں رہتے تھے اور بغیر مشاعروں کے بھی رئیسوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے انھیں بیسیوں جگہ مفت پڑھتے سنا ہے۔ اس مشاعرے میں بھی پڑھنے وہ نیاز صاحب کی طرح پورا خرچہ لے کر ہندستان سے کراچی نہیں آئے تھے بلکہ یہاں پہلے سے موجود تھے اور ان کا مشاعرے میں شریک ہو جانا ہی نیاز صاحب کے بہتان کی تردید کے لیے کافی ہے۔ جگر صاحب ایک شریف النفس انسان تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا کسی کو دکھ نہیں پہنچاتے تھے۔ جگر صاحب ایک سیر چشم آدمی تھے۔ روپیہ پیسہ ان کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے ان کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہ شراب کے نشے میں دھت رہا کرتے تھے اور کوڑی کوڑی کو محتاج۔ مگر میں نے آج تک کسی سے نہیں سنا کہ جگر نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا ہو۔ مدہوشی میں بھی انھوں نے اپنی غیرت وخودداری کو ہاتھ سے نہیں دیا۔

نخشب جارچوی نے جگر صاحب کا ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی فلم کے لیے جگر صاحب کی ایک غزل ریکارڈ کرنی تھی۔ جگر صاحب کو اس کا معاوضہ ٹھیک یاد نہیں رہا۔ پانچ ہزار یا آٹھ ہزار پیشگی دے دیا گیا۔ جگر صاحب اس سے پہلے ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے اپنا کلام نشر بھی کر چکے تھے اور ریکارڈ بھی کرا چکے تھے۔ لہٰذا نہایت اطمینان سے فلم کے لیے بھی اپنی ریکارڈنگ کرانے کے لیے بیٹھ گئے مگر جب اپنا ریکارڈ خود سنا تو سٹ پٹا گئے اور اسے ناپسند کر کے دوبارہ ریکارڈ کیا۔ مگر اس دفعہ بھی انھیں اپنا ریکارڈ نہایت بےسُرا معلوم ہوا۔ تیسری دفعہ اور چوتھی دفعہ بھی ناکام رہے۔ غرض چھ دفعہ یہی ماجرا پیش آیا۔ سخت بددل ہوئے۔ کمپنی والوں نے کہا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ

کل پھر تشریف لائیے۔" گھر پہنچ کر نخشب سے بولے۔" خدا جانے کیا بات ہے کہ ریکارڈ اچھا نہیں بن رہا' تم ایسا کرو کہ یہ روپیہ واپس کردو اور مجھے آج سوار کرادو۔" نخشب صاحب نے انھیں تسلی دی اور ایک دن کے لیے اور انھیں روکنے میں کامیاب ہوگئے۔ اگلے دن بھی کئی ریکارڈ لیے مگر سب ناقص رہے۔ جگر صاحب کی پریشانی اور شرمندگی بڑھتی جارہی تھی۔ اور ریکارڈنگ بد سے بدتر ہوئی جارہی تھی۔ نخشب صاحب کو ایک ترکیب سوجھی۔ مائیکروفون ان کے سامنے سے ہٹادیا اور بولے "کچھ دیر توقف کیجیے' چائے وائے پیجیے' پھر دیکھا جائے گا۔" جگر صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔" میاں تم ان کا روپیہ واپس کردو اور مجھے گھر جانے دو۔" انھوں نے کہا۔" بہت اچھا روپیہ واپس کردیا جائے گا۔ مگر آپ اطمینان سے بیٹھ کر چائے تو پی لیجیے۔ جگر صاحب خوش ہوگئے جیسے منوں بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہنس ہنس کر کرنے لگے۔ چائے پی چکے تو نخشب نے کہا" دراصل آپ کو مائیکروفون کا احساس ہوجاتا ہے۔اب اگر آپ پڑھیں گے تو بالکل ٹھیک پڑھیں گے۔ ذرا پڑھیے تو؟ جگر صاحب پڑھنے لگے۔ جب پڑھ چکے تو اس کا ریکارڈ انھیں سنایا گیا۔ حیران ہو کر بولے یہ "کون سا ریکارڈ ہے؟ یہ تو ٹھیک ہے۔" نخشب نے بتایا کہ "ابھی جو آپ پڑھ رہے تھے۔ اس کا ریکارڈ ہے۔"" مگر کب اور کیسے ریکارڈ کرلیا؟"" جی یہ ہمارے Tricks of The Trade ہیں۔ اب گھر چلیے۔ روپے واپس کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔"

جس شخص کا یہ کردار ہو وہ پیسے کا میت کیسے ہو سکتا ہے؟ جب وہ پانچ ہزار سے دست کش ہو سکتا ہے تو کیا پانچ سو کے مشاعرے کو نہیں چھوڑ سکتا؟ وہ مشاعرے میں روپے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے شریک ہوئے کہ ان کی عدم شرکت سے مشاعرے کے کارکنوں کے ساتھ سامعین کی بھی دل آزاری ہوتی اور خود جناب نیاز کو خفت اٹھانی پڑتی۔ جگر صاحب کو جو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی وہ کسی نے ہاتھ اٹھا کر خیرات میں انھیں نہیں دی تھی۔ ادب دوستوں نے انھیں رئیس المتغزلین قرار دیا تھا۔ اگر انھیں شہنشاہ تغزل کہا گیا (یہ نیاز صاحب ہی کا بیان ہے) تو شہنشاہیت کا تاج بھی خاصان ادب ہی نے ان کے سر پر رکھا ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ جگر صاحب محسود تھے' حاسد نہیں تھے' شریف آدمی حاسد نہیں ہوتے۔

جگر صاحب "شعلہ طور" کی اشاعت سے پہلے بھی شاعر تھے۔ اور ان کا ایک مجموعہ کلام شائع ہو کر گمنام ہو چکا تھا۔ اس زمانے کے کلام میں بھی ایک تیکھاپن تھا۔ مگر سنا ہے کہ کسی معرکہ عشق میں ناکام ہونے کے بعد ان کے ساتھ ان کے کلام کی بھی دنیا بدل گئی۔ جگر کی غزل میں جو نیا مزاج پایا جاتا ہے وہ اسی محرومی کا نتیجہ ہے۔ عشق کی آگ بھڑک کر شعلۂ طور بن گئی۔ "شعلہ طور" کا پہلا اڈیشن چھپتے ہی ختم ہو گیا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے شاعر اور کلام شاعر کا تعارف کرایا تھا۔ میرے پاس جب یہ نسخہ ریویو کے لیے آیا تو میں نے اور انصار ناصری نے جگر ہی کی دھنوں میں لہک لہک کر پوری ایک رات اسے ختم کرنے میں صرف کر دی تھی۔ اس اڈیشن میں ادیاما کا بنایا ہوا جگر کا ایک پنسل اسکیچ بھی تھا جو اس قدر اعلا درجہ کا تھا کہ ہم اسے کسی غیر ملکی آرٹسٹ کا کارنامہ سمجھتے رہے۔ بعد میں جامعہ ملیہ میں ادیاما سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہمارے ہی ملک کا ایک دھان پان سا نوجوان ہے جس کے دل میں آگ بھری ہوئی ہے' دو چار دفعہ کی ملاقات کے بعد جب اس سے پوچھا کہ یہ آپ نے اپنا نام کیا رکھا ہے تو اس نے بتایا کہ ادیاما جاپانی زبان میں جوالا مکھی کو کہتے ہیں' پر اسرار سا آدمی تھا۔ دلی سے غائب ہو گیا۔ پھر سنا کہ مر گیا۔

جگر صاحب ایک زمانے میں مچھلی کی طرح شراب پیتے تھے۔ ان کے قدردانوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا تھا کہ جب ان کا کلام سننا ہوتا تو ان کے لیے ایک بوتل منگا لیتے۔ سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا۔ گھنٹوں اپنا کلام سناتے رہتے۔ پھر ان کا لپکا اتنا زیادہ ہو گیا کہ ہر وقت پینے لگے۔ جگر صاحب کی زندگی کا یہ دور ثقہ حضرات کے نزدیک خاصا قابل اعتراض تھا مگر مدہوشی کا یہی دور ان کی شاعری کے عروج کا دور تھا۔ ان کے قدردان اور مشاعرے والے جام ے کی مانند انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ روپیہ ان پر برستا تھا۔ مگر وہ کل کے لیے آج شراب میں خست نہیں کرتے تھے۔ روپیہ ادھر آیا اور ادھر شراب بن کر اڑا۔ خبر نہیں گھر کی زندگی اس شراب نوشی کی وجہ سے اجڑی یا گھر کی اجڑی ہوئی زندگی نے کثرت ے نوشی کے پر لگائے' دنوں مہینوں گھر کا رخ نہ کرتے۔ آج اس کے ہاں ٹھہرے ہیں' کل اس کے ہاں۔ اصغر گونڈوی ان کے بڑے ہم زلف تھے۔ جب انھوں نے میاں بیوی میں نااتفاقی کی یہ صورت دیکھی تو جگر سے کہا کہ اپنے ساتھ بیوی کی زندگی کیوں خراب کر رہے ہو؟ طلاق دے دو۔ اصغر کا جگر صاحب بہت ادب کرتے تھے تعمیل ارشاد

میں طلاق دے دی۔ شراب اور بھی بڑھ گئی' اتنی کہ مشاعروں کے اسٹیج پر بھی بوتل اور گلاس ساتھ رہنے لگا۔ غزل پڑھتے پڑھتے بھول جاتے اور سامعین خاصے بے لطف ہوتے مگر ان کے کلام اور ان کے کمال کی وجہ سے ان کی اس لغویت کو نظر انداز کر دیتے۔ کچھ رسم ایسی پڑ گئی تھی کہ بغیر جگر کے کوئی مشاعرہ کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بہت سے ذہین شاعروں کو شراب سے تباہ و برباد ہوتے دیکھا ہے۔ اختر شیرانی' میراجی اور مجاز کا تو آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ اسٹیج پر نہ صرف قے کر دیتے تھے بلکہ پیشاب بھی کر دیتے تھے اور لوگ انھیں اٹھا کر ان کے ٹھکانوں پر پہنچایا کرتے تھے۔ جگر صاحب اتنے نہیں گرے تھے۔ انھیں پھر بھی ہوش رہتا تھا۔ اوروں کی طرح اول فول بکنے نہیں لگتے تھے۔ ان لوگوں میں اور بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے لوگ ان سے بھاگنے لگے تھے۔ جگر صاحب نے کسی کی بہو بیٹی کو نہیں تاکا۔ کسی سے بھیک نہیں مانگی۔ تانگے والوں اور چھکلے والوں سے انھیں لڑتے ہوئے نہیں دیکھا اور پٹتے ہوئے کبھی نہیں پائے گئے۔ ان کی شراب خوری کے نقصانات ان ہی کی ذات تک محدود تھے' دوسروں کو ان کا خمیازہ بھگتنا نہیں پڑتا تھا۔ اوروں کی شاعری دم توڑتی چلی گئی' جگر کی شاعری توانا سے توانا تر ہوتی چلی گئی۔ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ جگر کی شرافت نفس میں فرق نہیں آیا اور اسی وجہ سے ان کی نفاست شاعری بھی قائم رہی۔

زنداں نامہ

قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا‘ جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء‘ ۱۹۳۱ء‘ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی‘ اور اب پھر اسی منزل سے قافلۂ بادپیمائے عمر گزر رہا ہے ع

بازمی خواہم ز سر گیرم رہ پیمودہ را

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے‘ تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ عمر کے ترپن برس جو گزر چکے ہیں‘ ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں‘ تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گزرا۔ تورات کے احکام عشرہ میں ایک حکم سبت کے لیے بھی تھا یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی‘ سو ہمارے حصہ میں بھی سبت کا دن آیا مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں ‘گویا خواجہ شیراز کے دستورالعمل پر کاربند رہے:

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن
سہ ماہ مے خور و نُہ ماہ پارسامی باش

وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے ‘اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے!

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

وقت کے جو حالات ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں‘ ان میں اس ملک کے باشندوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی دو ہی راہیں رہ گئی ہیں‘ بے حسی کی زندگی بسر کریں یا احساس حال کی۔ پہلی زندگی ہر حال میں اور ہر جگہ بسر کی جاسکتی ہے‘ مگر دوسری کے لیے قید

خانہ کی کوٹھری کے سوا اور کہیں جگہ نہ نکل سکی۔ ہمارے سامنے بھی دونوں راہیں کھلی تھیں۔ پہلی ہم اختیار نہیں کر سکتے تھے' ناچار دوسری اختیار کرنی پڑی:

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود
لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

زندگی میں جتنے جرم کیے اور ان کی سزائیں پائیں' سوچتا ہوں تو ان سے کہیں زیادہ تعداد ان جرموں کی تھی جو نہ کر سکے اور جن کے کرنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ یہاں کردہ جرموں کی سزائیں تو مل جاتی ہیں لیکن ناکردہ جرموں کی حسرتوں کا صلہ کس سے مانگیں:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

۱۹۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں۔ اُس وقت عمر کے صرف ۲۷ برس گزرے تھے۔ "الہلال" "البلاغ" کے نام سے جاری تھا۔ "دارالارشاد" قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا اور علاقوں اور رابطوں کی گرانیوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا' اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کر لینی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلاب حال میں طبیعت کے لیے بڑی آزمائش ہونی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑا اور ایک ویرانے میں جا بیٹھ رہا:

نقصاں نہیں جنوں میں' بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں!

لیکن پھر کچھ عرصہ کے بعد جب اس صورت حال کا ردِ فعل شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ معاملہ اتنا سہل نہ تھا' جتنا ابتدائے حال کی سرگرمیوں میں محسوس ہوتا تھا اور اس کی آزمائشیں ابھی گزر نہیں چکیں' بلکہ اب پیش آرہی ہیں۔

جب کبھی اسی طرح کا معاملہ یکایک پیش آجاتا ہے' تو ابتدا میں اس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتیں' کیونکہ طبیعت میں مقاومت کا ایک سخت جذبہ پیدا ہو جاتا ہے' اور وہ نہیں چاہتا کہ صورت حال سے دب جائے' وہ اس کا غالبانہ مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا

ہے کہ ایک پُر جوش نشہ کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ نشہ کی تیزی میں کتنی ہی سخت چوٹ لگے اس کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ تکلیف اس وقت محسوس ہوگی' جب نشہ اترنے لگے گا اور جماہیاں آنی شروع ہوں گی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوگا' جیسے سارا جسم درد سے چور چور ہو رہا ہو۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی پہلا دور نشۂ جذبات کی خود فراموشیوں کا گزرا' علائق کا فوری انقطاع' کاروبار کی ناگہانی برہمی' مشغولیتوں کا یک قلم تعطل' کوئی بات بھی دامن دل کو کھینچ نہ سکی۔ کلکتہ سے بہ اطمینان تمام نکلا اور رانچی میں شہر کے باہر ایک غیر آباد حصہ میں مقیم ہو گیا لیکن پھر جوں جوں دن گزرتے گئے' طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگیں اور صورت حال کا ایک ایک کانٹا پہلوئے دل میں چبھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنی طبیعت کی اس انفعالی حالت کا مقابلہ کرنا پڑا اور ایک خاص طرح کا سانچا اس کے لیے ڈھالنا پڑا۔ اس وقت سے لے کر آج تک کہ چھبیس برس گزر چکے' وہی سانچا کام دے رہا ہے اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی برابر بڑھتی گئی لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں فلسفہ سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ یہ بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی' بے پروائی پیدا کر دیتا ہے' اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے کچھ بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یہ ہمیں ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تسکین سر تا سر سلبی تسکین ہوتی ہے' ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ فقدان کا افسوس کم کر دے گا لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائے گا۔ اگر ہماری راحتیں ہم سے چھین لی گئی ہیں تو فلسفہ ہمیں کلیلہ و دمنہ' پنچ تنتر کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحت کرے گا: لاتاس علی مافات (جو کچھ کھو چکا' اس پر افسوس نہ کر) لیکن کیا اس کھونے کے ساتھ کچھ پانا بھی ہے' اس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں بتلاتا کیونکہ بتلا سکتا ہی نہیں اور اس لیے زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے کے لیے صرف اس کا سہارا کافی نہ ہوا۔

سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت (Physical Determinism) کی خبر دیتا ہے اس لیے عقیدہ کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی۔ وہ یقین اور امید کے سارے پچھلے چراغ گل کر دے گا' مگر کوئی نیا

چراغ روشن نہیں کرے گا!

پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لیے نظر اٹھائیں، تو کس کی طرف اٹھائیں؟

کون ایسا ہے جسے دست ہو دلسازی میں،
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے اک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے:

دل شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود تشناسی کہ از کجا بشکست

بلاشبہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لیے باقی نہیں رہی۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بیرنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے، اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔

در دیگرے بنما کہ من بکجا روم، چو برانیم

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا، اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے دے گا، مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف انہی باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے جنھیں ثابت کر سکتے ہیں اور اس لیے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنھیں ثابت نہیں کر سکتے، لیکن مان لینا پڑتا ہے۔

عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا، میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈھنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی اور

موروثی عقائد جس شکل وصورت میں سامنے آ کھڑے ہوئے تھے ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ پہلے اسلام کے اندرونی مذاہب کے اختلافات سامنے آئے اور ان کے متعارض دعووں اور متصادم فیصلوں نے حیران وسرگشتہ کردیا۔ پھر جب کچھ قدم آگے بڑھے تو خود نفس مذہب کی عالمگیر نزاعیں سامنے آگئیں اور انھوں نے حیرانگی کو شک تک اور شک کو انکار تک پہنچادیا۔ پھر اس کے بعد مذہب اور علم کی باہمی آویزشوں کا میدان نمودار ہوا اور اس نے رہاسہا اعتقاد بھی کھودیا۔ زندگی کے وہ بنیادی سوال جو عام حالات میں بہت کم ہمیں یاد آتے ہیں' ایک ایک کرکے ابھرے اور دل ودماغ پر چھاگئے۔ حقیقت کیا ہے اور کہاں ہے' اور ہے بھی یا نہیں! اگر ہے اور ایک ہی ہے کیونکہ ایک سے زیادہ حقیقتیں ہو نہیں سکتیں' تو پھر راستے مختلف کیوں ہوئے! کیوں صرف مختلف ہی نہیں ہوئے' بلکہ باہم متعارض و متصادم ہوئے۔ پھر یہ کیا ہے کہ خلاف ونزاع کی ان تمام لڑتی ہوئی راہوں کے سامنے علم' اپنے بے لچک فیصلوں اور ٹھوس حقیقتوں کا چراغ ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اور اس کی بے رحم روشنی میں قدامت اور روایت کی وہ تمام پُراسرار تاریکیاں جنھیں نوع انسانی عظمت وتقدیس کی نگاہ سے دیکھنے کی خوگر ہوگئی تھی ایک ایک کرکے نابود ہورہی ہیں!

یہ راہ ہمیشہ شک سے شروع ہوتی ہے اور انکار پر ختم ہوتی ہے' اور اگر قدم اسی پر رک جائیں تو پھر مایوسی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا:

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

مجھے بھی ان منزلوں سے گزرنا پڑا' مگر میں رکا نہیں۔ میری پیاس مایوسی پر قانع ہونا نہیں چاہتی تھی' بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا' اس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچادیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف ونزاع کی انہی متعارض راہوں اور اوہام وخیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے جو یقین اور اعتقاد کی منزل مقصود تک چلی گئی ہے اور اگر سکون وطمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے تو وہیں مل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھودیا تھا' وہ اسی جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا' میری بیماری کی جو علت تھی' وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی:

انارکلی

باب سوم

منظر اول

اگلے روز سہ پہر کو سلیم کا مثمن برج والا ایوان۔

سلیم کے عشق کا راز طشت از بام ہو چکا ہے۔ تمام قلعے میں اس کے اور انارکلی کے خفیہ تعلقات پر چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔ اس نے خود صاف الفاظ میں اعتراف عشق کر لیا ہے۔ صبح سے اب تک انارکلی کی رہائی کے لیے اکبر کے حضور میں ہر ممکن ذریعے سے منتیں خوشامدیں' التجائیں' اور سفارشیں بھیجتا رہا لیکن بارگاہ اکبری میں رانی کے سوا کسی کو باریابی حاصل نہیں ہو سکی اور حسب امید وہ بھی مایوس چہرہ اور ملول نگاہیں لے کر واپس آ گئی۔ ناامید ہو کر بختیار کو زبردستی داروغۂ زنداں کے پاس بھیجا ہے کہ کسی قیمت یا وعدے پر رات میں انارکلی سے ملاقات کی صورت نکال کر آئے۔

تفکرات اور اندیشوں کے باعث صبح سے اب تک جنوں کی سی کیفیت میں گزارا ہے۔ نہ منہ ہاتھ دھویا ہے' نہ خط بنوایا ہے' نہ لباس تبدیل کیا ہے' نہ صبح سے اب تک کچھ کھایا ہے۔ مجبور ہو کر متفکر ماں سمجھانے بجھانے کی غرض سے خود اس کے ایوان میں آئی ہے۔ سلیم اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس سے بپھرا ہوا مسند پر بیٹھا ہے۔ رانی پاس بیٹھی اسے منا رہی ہے۔

رانی: سلیم! اپنے باپ سے خفگی! یوں بھی کہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی کہیں اولاد کو زیب دیتا ہے؟

سلیم: اولاد پر ظلم ماں باپ کو بھی زیب نہیں دیتا۔

رانی: اولاد پر ظلم' اور پھر تجھ سی اولاد پر! کیا کہتا ہے بیٹے؟ تو کیا جانے تیری آرزو میں ماں باپ نے زندگی کے کتنے دن آہیں بنا کر اڑا ڈالے۔ زندگی کی کتنی راتیں آنسو

بنا کر بہاڑ الیں۔ تو نہ تھا تو یہ زندگی شمشان کی طرح اجاڑ اور سنسان تھی۔ یہ محل خزاں کے رات کی طرح ویران کھڑے تھے۔ اس ہندستان کا سہاگ بگڑا جارہا تھا اور میرے دولھا! پھر تو آیا اور زندگی آئی اور بہار آئی۔ میرے چاند! ہم ہنس پڑے۔ دنیا ہنس پڑی۔ خود تقدیر ہم پر ہنس پڑی۔ پھر ماں باپ تجھ پر ظلم کریں گے، کس دل سے سلیم؟

سلیم: آپ کے نزدیک مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوا تو میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا (غصے سے منہ موڑ لیتا ہے۔)

رانی: کیا ظلم؟ کہ انار کلی قید کر لی گئی۔ سلیم! کیوں دیوانہ ہوا ہے؟ وہ تیرے قابل ہے؟ اگر تو باپ ہوتا اور بادشاہ' اپنی اولاد کے لیے نہ جانے کیا کیا امیدیں اور امنگیں تیرے دل میں ہوتیں۔ اور پھر تیرا بیٹا ایک کنیز کی محبت میں گرفتار ہو جاتا تو تو' یہی کچھ نہ کرتا اور جسے ظلم کہہ رہا ہے اسے اولاد کے حق میں محبت نہ سمجھتا؟

سلیم: (سامنے تکتے ہوئے) میں اولاد کی خوشی کو اپنی مصلحتوں پر ترجیح دیتا۔

رانی: نوجوان ہے۔ نا تجربہ کار ہے۔ باپ بن کر سوچنا نہیں آتا۔

سلیم: باپ بنا انصاف کی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ (کھڑا ہوا منہ دوسری طرف کر لیتا ہے۔)

رانی: سلیم! ماں باپ کو اپنی زندگی بھر کی آرزوئیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رہتی ہیں۔ انھیں نامکمل چھوڑ دینا یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اولاد کو بے آسرا چھوڑ کر گزر جانا۔ پھر تیرا اپنے ماں باپ کی آرزوؤں کو پامال کرنا انھیں کیسے خوش کرے؟ انھیں کیسے نہ معلوم ہو کہ ان کی اولاد ہی آپس میں کشت و خون کر رہی ہے؟

سلیم: (جل کر) اگر ماں باپ اپنی اولاد کے لیے اپنی قربانیوں کو بھولنا نہیں جانتے تو ان کا اپنی اولاد کی آرزوؤں پر اپنی آرزوؤں کو مقدم سمجھنا بے معنی ہے۔ (غصے میں ٹہل کر کمرے کے پچھلے حصے میں چلا جاتا اور منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔)

رانی: آج تو کیا کہہ رہا ہے بچے! اس ننھے سے دل میں ماں باپ کے خلاف اتنا زہر بھر گیا؟ صرف اس لیے کہ وہ نہیں چاہتے تو ایک حرم کی کنیز سے شادی کرے اور دنیا

کی نظروں میں اپنے آپ کو سبک بنالے!

سلیم: میں جانتا ہوں یہ دنیا کس طرح دیکھنے کی عادی ہے۔ (غصے سے مڑ کر) جایئے دنیا کی عظیم ترین سلطنت کی لختِ جگر کو میرے پہلو کی زینت بنا دیجیے اور میں پھر بھی دنیا کی یہ سرگوشیاں آپ کے کانوں تک پہنچادوں گا' اس احمق کو دیکھو جس نے سیاست کے پیچھے اپنے آپ کو بیچ ڈالا' جایئے فردوس سے میرے لیے ایک حُور مانگ لایئے۔ پھر بھی میں دنیا کی نظروں میں یہ طعنے لکھے ہوئے دکھادوں گا۔ یہ بدنصیب عورت کی دل فریبیوں کو کیا جانے؟ (نفرت سے) دنیا اور اس کی نظریں! پھر اگر انارکلی کو اپنا بنا لینے پر یہ دنیا کہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے تو میں دل کھول کر ہنس سکتا ہوں۔

رانی: (سلیم کے قریب جاکر محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔) لیکن سلیم! ہم اسی دنیا کے خادم ہیں۔ ہمیں جو کچھ بنایا ہے اسی دنیا نے بنایا ہے۔ ہندستان کی باگ ہمارے ہاتھ میں دے کر یہ دنیا ہمارے ایک ایک فعل کو تاڑ رہی ہے۔ ہم اس دنیا سے بے پروا کیسے ہو سکتے ہیں؟

سلیم: اکبرِ اعظم اور دنیا کے تعلقات پر کوئی دوسرا فرزند قربان کر دیجیے۔ سلیم کے ہاتھ ہندستان کی باگ سنبھالنے کے لیے آزاد نہیں۔

رانی: سلیم! تو جو کچھ کہہ رہا' سمجھ نہیں رہا۔

سلیم: میں سمجھ رہا ہوں' خوب سمجھ رہا ہوں۔ لے لیجیے مجھ سے' سب کچھ لے لیجیے۔ ان محلوں کی عشرت' ہندستان کی سلطنت' دنیا کی حکومت' خزانوں کی دولت' سب کچھ لے لیجیے اور مجھ کو اور انارکلی کو تنہا چھوڑ دیجیے جہاں میں صرف اس کو دیکھوں' اس کو سنوں۔ میں اپنی فردوس میں پہنچ جاؤں گا اور ماں باپ کے احسان کی یاد میں میری آنکھیں ہمیشہ پُرنم رہیں گی۔ (مڑ کر مسند کے قریب آجاتا ہے)۔

رانی: (وہیں پیچھے کھڑے کھڑے) اور اگر تیرا باپ یوں نہ مانے؟

سلیم: (توقف کے بعد) تو ان سے کہہ دیجیے اگر وہ بادشاہ ہیں تو میں بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ اگر ان کی رگوں میں مغلیہ خون دوڑ رہا ہے تو میری رگوں میں راجپوتوں کا لہو بھی بے تاب ہے اور میں جانتا ہوں تلوار سے کیا کام لیا جا سکتا ہے!

(چیں بہ جبیں سامنے تکتا ہوا مسند پر بیٹھ جاتا ہے)

رانی: (قریب آکر) بچے! سلیم! تجھے کیا ہو گیا؟ تو سلیم ہے نا؟ میرا بیٹا! اور تو یہ بول رہا ہے؟

سلیم: (بھرّائی ہوئی آواز میں) سلیم 'آپ کا بیٹا۔ آپ کا اور اکبر اعظم کا بیٹا۔ نامراد اور رسوا بیٹا۔ بدبخت شہزادہ۔ (سلیم کے آنسو نکل آتے ہیں۔)

رانی: (سلیم کو روتا دیکھ کر بے قرار ہو جاتی ہے۔ قریب بیٹھ کر اسے لپٹا لیتی ہے۔) میری جان! میرا لال! میرا چاند! یہ آنسو! یہ ماں کا لہو'! میں تجھے انارکلی دوں گی۔ تیرے باپ سے لے کر دوں گی۔

سلیم: اماں! (اماں سے آنکھیں چار کر کے اس سے لپٹ جاتا ہے۔)

رانی: میرا بچہ (اسے سینے سے لگا لیتی ہے۔)

رشید احمد صدیقی

علی گڑھ کے مشاعرے

مشاعرے کی علی گڑھ میں بڑی اہمیت رہی ہے۔ محض شعر و سخن کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک تہذیبی روایت کے اعتبار سے بھی۔ یہی بات کم و بیش ان مشاعروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جو ملک کے مختلف حصوں میں کثرت سے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ مشاعروں کا جتنا چرچا پہلے تھا اس سے کہیں زیادہ اب ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری، بالخصوص اردو غزل کو ہر طبقہ میں کس درجہ قبول عام نصیب ہے اور مذہبی تقاریب کے بعد اردو مشاعروں کے لیے عام ہندستانیوں کے دلوں میں بلاقید مذہب و ملت کتنی وسعت ہے۔

مشاعروں کی روایت عرب سے ایران ہوتی ہوئی ہندستان پہنچی۔ اس کو جتنی ترقی اور شہرت یہاں نصیب ہوئی شاید خود عرب و ایران میں نہ ہوئی ہو۔ آج کل مشاعروں کا جو رنگ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے اس سے اکثر یہ بات دل میں آتی ہے کہ جس طرح شعر گوئی اور شعر خوانی عرب کے میلے اور بازاروں سے شروع ہو کر ایران اور ہندستان کے سلاطین اور امرا کے درباروں تک پہنچی' اس طرح وہ اب درباروں سے نکل کر بازاروں میں پہنچ گئی ہے۔ اس پر حسب توفیق ہم خوش یا ناخوش ہو سکتے ہیں۔ ہمارے خوش یا ناخوش ہونے کا بہت کچھ مدار اس پر ہے کہ پہلے زمانے کے بازار اور میلوں اور آج کل کے بازار اور میلوں میں ہم فرق کرتے ہیں یا نہیں اور ایسا کرنا بھی چاہیے یا نہیں!

شعر و سخن کی ترقی اور اشاعت کا ایک موثر اور معقول ذریعہ مشاعرہ سمجھا جاتا تھا۔ سلاطین اور امرا کے درباروں تک رسائی حاصل کرنے اور ہم چشموں میں امتیاز پانے کا ایک بڑا وسیلہ شاعری تھا۔ اب سے چند سال پہلے تک شعر و ادب کی سرپرستی تمام تر والیان ملک اور اکابر و امرا کی ذات اور ان کی ریاست سے وابستہ تھی۔ علی گڑھ شعرا کی ان معنوں

میں تو کفالت نہ کر سکتا تھا لیکن ان کی قدر و منزلت میں بیش از بیش حصہ لیتا رہا، اور اس اعتبار سے شعر و سخن کی ترقی میں علی گڑھ کا بڑا قیمتی حصہ رہا ہے، جس کی نظیر شاید کسی دوسری درسگاہ میں نہ ملے۔ کسی شاعر کے کلام کو علی گڑھ میں حسن قبول حاصل ہو جاتا تو اس کے اچھے اور مستند شاعر ہونے کی حیثیت مسلّم ہو جاتی۔ فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ کا کلام علی گڑھ میں بہت پسند کیا گیا اور میں جانتا ہوں کہ اس میں عصبیت کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایک زمانہ میں لاہور کے بعض عزیز دوستوں نے منظم طور پر یہ الزام دینا شروع کر دیا تھا کہ علی گڑھ اصغر کے کلام کو بے جا طور پر شہرت دے رہا ہے اور یوپی (U.P) سی پی (C.P) قسم کے تعصب میں مبتلا ہے، حالانکہ اس زمانے میں علی گڑھ میں حفیظ جالندھری صاحب کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی بڑا مشاعرہ منعقد ہونے والا ہوتا تو اس کا اہتمام کیا جاتا کہ موصوف کو ہر قیمت پر بلایا جائے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مدعو کرنے کی ذمہ داری میرے سپرد کی جاتی تھی۔ خود اصغر صاحب مرحوم مجھ سے کہا کرتے تھے۔ "دیکھیے حفیظ کی طرف سے غافل نہ ہو جیے گا، اس میں اعلا شاعری کی غیر معمولی صلاحیت ہے، ایسا نہ ہو کہ رائیگاں جائے۔" علی گڑھ پر عصبیت کا الزام رکھنے والوں نے اس بارے میں خود حفیظ صاحب سے شاید کبھی گفتگو نہیں کی کہ علی گڑھ میں ان کی پذیرائی کس خلوص اور خوشی سے کی جاتی تھی!

حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ، فانیؔ کے مولانا سہیلؔ بڑے مداح تھے۔ حسرت سے سہیلؔ کو یوں بھی بڑی عقیدت تھی جس زمانے میں حسرت کا قیام علی گڑھ میں تھا اور سیاسی معتقدات کی وجہ سے حکومت کے زیر عتاب تھے، ان کے ہاں شاید ہی کسی کا آنا جانا ہوتا۔ مولانا سہیلؔ دسویں پندرھویں ضرور ملنے جاتے۔ یونین میں انجمن حدیقۃ الشعرا کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ ثاقبؔ، صفیؔ اور محشرؔ صاحبان لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ ثاقب صاحب کا کلام اس مشاعرے میں بہت پسند کیا گیا جن کے یہ دو اشعار کالج کے ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھے:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ہے روشنی قفس میں، مگر سوجھتا نہیں
ابر سیاہ جانب کہسار دیکھ کر

ثاقبؔ صاحب نے دوسرے شعر کے پہلے مصرعے کو کئی بار پڑھا اور ہر بار نئے انداز سے بتا کر پڑھا' اس کے بعد ثانی مصرع فرمایا' تو جیسے پورا مشاعرہ اچھل پڑا۔ دیر تک اور رہ رہ کر ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ ثاقبؔ صاحب نے آنکھوں کو جس طرح گردش دے کر ان کی بے نوری کا اظہار کیا اور کمزور کپکپاتے ہاتھوں سے فضا کو ٹٹول کر بے بسی کے ساتھ گر جانے دیا' وہ اب تک نہیں بھولا ہے۔ شعر کو بتا کر پڑھنے میں کسی تصنع کے شائبہ بغیر لیکن ہر صنعت سے بھرپور اور اس امر کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے کہ کوئی انداز پایہ ثقاہت سے گرنے نہ پائے۔ جو کمال ثاقب صاحب کو تھا میں نے آج تک کسی شاعر میں نہ دیکھا۔ یہ کمال جیسے ان ہی پر ختم ہو گیا ہو۔

اس مشاعرے میں جناب اطہر جے پوری' (متوطن ہاپوڑ) پہلی بار شریک ہوئے تھے۔ موصوف اس وقت تک علی گڑھ میں معروف نہ تھے۔ دو تین ہی شعر پڑھے ہوں گے کہ مولانا سہیلؔ چونکے اور حسب عادت فوراً کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ گھٹنوں میں دونوں مٹھی لے لی اور ان پر ٹھوڑی رکھ دی' پھر سر ہلا کر بولے "یہ شخص رموز شعر سے واقف معلوم ہوتا ہے۔" جلسے کے بعد مشاعرے کی اچھی غزلوں یا منتخب اشعار کے ساتھ جناب اطہر کے بارے میں مولانا سہیلؔ کا یہ فقرہ بھی لوگوں کی زبان پر تھا۔ واقف کار جانتے ہیں کہ اتنا پہلے اور پہلی بار سہیلؔ صاحب کا یہ فرمانا کتنا صحیح تھا اور فن شعر میں اطہر صاحب کی استادی کس طرح چالیس سال سے اوپر تک مسلّم رہی۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس عہد میں علی گڑھ کی یہ سخنور اور سخن فہم جماعت اساتذہ سے نہیں بلکہ طلبہ میں سے ہوتی تھی اور عجیب تر یہ کہ اس زمانے میں تہذیبی روایات اور امتیازات کے نمایندے بھی طلبہ ہی تھے!

شاعری میں استادی' شاگردی اور مذہب واخلاق میں مرشد مرید' یا گرو چیلا کا رشتہ کہیں اور نہیں تو ایشیائی ممالک میں اتنا قوی اور محترم مانا گیا ہے کہ اس کو کبھی کبھی خون کے رشتے سے زیادہ وقعت دی گئی ہے۔ اس طرح کے رشتے یا ادارے زمانہ جہالت کے یادگار ہوں یا دور اجتہاد وانقلاب کے' اس سے بحث نہیں۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ ذوق شعر وادب کی سیرابی اور صحت مندی کے لیے شاگردی استادی' اور اعمال وافکار کے سنوارنے سدھارنے کے لیے مرشد مرید یا گرو چیلے کا جو رشتہ یا ادارہ مشرق میں مدت

الایام سے چلا آرہا ہے' وہ اپنے گوناگوں فوائد کے اعتبار سے بہت اہم اور قابل قدر مانا گیا ہے' اور ہندستانی تمدن میں اس رشتے اور رابطے کا ایک خاص مقام ہے۔ آج کل نوجوانوں میں جو عام ذہنی انتشار ملتا ہے اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں ممکن ہے ایک یہ بھی ہو کہ استاد شاگرد یا مرشد مرید کا ''شخصی'' رشتہ جو مدتوں سے ''مجرب'' چلا آتا تھا اس کی طرف سے ہم نے اپنی توجہ ہٹالی ہے۔

شاعری میں استادی شاگردی کا رشتہ آج بھی قائم ہے لیکن محض برائے بیت۔ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اب نوجوان شعرا نہ صرف یہ کہ استاد کی ضرورت نہیں تسلیم کرتے بلکہ ''تلامیذ الرحمٰن'' ہونے کی حیثیت بھی گوارا نہیں کرتے۔ پہلے مستند ادارے' دربار یا شعر وادب کے اکابر محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے جہاں مشاعرے کے بڑے کڑے اصول برتے جاتے تھے۔ اب اکثر مشاعرے دولتمند تاجر اور ٹھیکے داروں کی طرف سے منعقد ہوتے ہیں یا کسی سیاسی یا نیم سیاسی مقصد کے پیش نظر اس طرح کے جلسے کیے جاتے ہیں جس کا مقصد شعر وادب کی اتنی خدمت نہیں ہوتا جتنا اپنے کاروبار کا اشتہار۔ اس طرح کے جلسوں میں جس طرح کی بدعنوانیاں دیکھنے میں آتی ہیں وہ بانیان تقریب اور شعرا میں سے کسی کے لیے قابل فخر نہیں کہی جاسکتیں' چنانچہ آج سے ۲۰۔۲۵ سال پہلے مشاعرے کا جو اصلاحی وتہذیبی اثر ہمارے شعر وادب' نیز ہمارے معاشرے پر پڑتا تھا وہ تقریباً مفقود ہو گیا ہے۔

کالج کے مشاعرے اور مباحثوں میں ''ہوٹنگ'' (Hooting) ہوتی تھی۔ فقرے بھی کسے جاتے تھے لیکن یہ ایسے ہوتے تھے کہ اکثر اچھے شعر کا مزہ دے جاتے۔ بدتمیزی اور بے غیرتی کا مظاہرہ نہ ہوتا تھا۔ طالب علم ہر زمانے میں طالب علم ہی رہا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ پہلے طالب علم فرشتے ہوتے تھے اور اب فرشتے کی دوسری قسم۔ زندگی اور زندہ دلی عبارت ہی ہے نوجوانوں اور طالب علموں سے لیکن وہ طالب علم ہی نہیں ''برہما'' کیوں نہ ہوں' انسانیت سے گزریں گے تو انسانوں کے نزدیک قابل مواخذہ ٹھہریں گے۔ نوجوانوں پر یہ راز آشکارا ہونا چاہیے کہ نالائقی کا جواز نہ مذہب ہے' نہ وطنیت' نہ سیاست' نہ مزدور' نہ سرمایہ دار نہ خود نوجوانی!

جگن ناتھ آزاد

پشکن کے دیش میں

اگلی صبح کو جاگا تو طبیعت پہلے سے بہتر تھی اگرچہ رات کو سویا بہت دیر میں تھا' لیکن جب سویا تو گہری نیند آگئی اس لیے صبح کو طبیعت بشاش تھی۔ دریائے ماسکو پر نظر ڈالی تو اسٹیمروں نے اس کے حسن کو دوبالا کر رکھا تھا۔ ایک دن قبل دس گیارہ بجے صبح تک مجھے اس میں کوئی اسٹیمر چلتا نظر نہ آیا تو مجھے اس دریا میں ایک کمی سی محسوس ہوئی۔ اسٹیمر کو دریا یا سمندر میں چلتا دیکھ کر آج بھی جبکہ میری عمر ۵۹ سے تجاوز کر چکی ہے مجھے وہی لطف آنے لگتا ہے جو بچپن میں انھیں دیکھ کر آتا تھا۔ اگرچہ میں بحری اور ہوائی جہاز میں اس وقت تک ہزاروں میل یا اس سے بھی زیادہ سفر کر چکا ہوں گا لیکن میری اس کیفیت میں کمی نہ آئی۔ بحری جہاز یا طیارے میں سفر کر کے وہ مزا نہیں ملتا جو باہر سے ان کو دریا یا سمندر میں تیرتے یا آسمان پر اڑتے دیکھ کے ملتا ہے۔

اس روز کریملن کی سیر اور لینن کے مقبرے پر جانے کا پروگرام تھا۔ دونوں میرے ہوٹل سے ڈیڑھ سو قدم پر تھے۔ سڑک کے اس پار پہلے لینن کے مقبرے کو دیکھنے کا ارادہ کیا' پہنچے تو کیو کی لمبائی کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کیو سارے ریڈ اسکوئر سے ہو کے الیگزنڈر پارک میں نظروں سے غائب ہو رہا تھا۔ ایک میل سے کم اس کی لمبائی کیا ہو گی اور پھر یہ بھی نہیں کہ ایک فرد کے پیچھے دوسرا فرد ہو' کیو کی چوڑائی دو اور بعض جگہ تین افراد پر مشتمل تھی۔ اس کیو میں اگر سب کے پیچھے کھڑا ہونا پڑتا تو اس روز مقبرے میں داخل ہونے کی باری کا کوئی امکان نہیں تھا۔ الیگزنڈر نے دو ایک پولس افسروں سے کہا کہ یہ ہندستان سے آئے ہوئے شاعر ہیں' اور سوویٹ رائٹرز یونین کے مہمان ہیں۔ ان افسروں نے مجھے مقبرے کے قریب ہی کیو میں ایک جگہ کھڑا ہونے کی اجازت دی۔ یہ

رعایت غیر ملکی مہمانوں کو اکثر مل جاتی ہے۔ خود روس میں ،ایک طبقہ ایسا ہے جسے لینن کی زیارت کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ رعایت حاصل ہے اور وہ دُلھنوں کا طبقہ ہے۔ ہر نئی بیاہی لڑکی اپنا یہ فرض سمجھتی ہے کہ پہلے ہی دن لینن کے مقبرے پر جائے۔ ان کے لیے کیو میں کھڑا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ موٹر سے اتر کر اپنے شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے' دوسرے رشتہ داروں سمیت کیو سے بے نیاز ہو کر سیدھا مقبرے میں پہنچ جاتی ہیں۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد نیا بیاہتا جوڑا کیو سے الگ مقبرے کی طرف جا رہا ہے۔ ہاں مقبرے میں داخل ہونے سے قبل انھیں کیو میں شامل ہونا پڑتا ہے کیونکہ مقبرے میں داخل ہونے سے لے کر باہر نکلنے تک خموشی کے ساتھ کیو میں چلنا ضروری ہے۔

مقبرے میں داخل ہوئے تو پہلے اندھیرے سے سابقہ پڑا' سیڑھیاں کافی نیچے اترتی چلی گئیں' پھر دوبار دائیں طرف کا چکر کاٹ کر اوپر سیڑھیاں چڑھنا شروع کیا۔ دو ایک سیڑھیاں چڑھے ہوں گے کہ بائیں طرف ایک پلیٹ فارم پر شیشے کے بکس میں لینن کی لاش محو استراحت نظر آئی۔ اوپر سے اس پر اتنی روشنی پڑ رہی تھی کہ چہرے کے تمام نقوش واضح تھے۔ صرف سر اور چہرہ گردن تک اور ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ باقی جسم غالبًا ایک پیتل کی چادر میں ڈھکا تھا۔ میں نے اس طرح سے کسی لاش کو زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ بہت متاثر ہوا' باہر آئے تو مقبرے کے پیچھے کریملن کی دیوار کے ساتھ روس کے متعدد لیڈروں' جرنیلوں' عالموں' اور شاعروں کی قبریں نظر آئیں۔ جو زیادہ بڑے لیڈر تھے ان کے مجسمے بھی قبروں کے اوپر بنے ہوئے تھے۔ اسٹالن کا مجسمہ بھی اس کی قبر کے اوپر روس کے بعض دوسرے لیڈروں کے ساتھ بنا ہوا نظر آیا۔ یہ بڑا عبرت کا مقام تھا۔ دراصل یہ غلطی اسٹالن کے حامیوں کی تھی کہ انھوں نے اسٹالن کے بڑکپن کو اپنی مرضی کے مطابق اہل روس پر مسلط کرنا چاہا۔ اسٹالن کی موت کے فوراً بعد اس کے حواریوں نے اس کی لاش کو لینن کی لاش کے ساتھ شیشے کے بکس میں رکھ کے اسے مرجع خاص و عام بنانا چاہا جس طرح لینن کی لاش ہے۔ اس کا ردِ عمل بہت جلد شروع ہو گیا کیونکہ یہ ناپسندیدہ طرزِ عمل کے تحت آتا تھا۔ آخر یہ لاش وہاں سے اٹھوا کے کریملن کی دیوار اور لینن کے مقبرے کے درمیانی جگہ میں دفن کر دی گئی۔

اسٹالن کے ہواخواہوں کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے اس کو لینن کے برابر عظیم کہنا شروع کر دیا تھا۔ اگر وہ یہ حرکت نہ کرتے تو غالباً روسی عوام اسٹالن کو لینن کے برابر تو نہیں لیکن لینن کے دوسرے نمبر پر ضرور اپنا رہنما تسلیم کرتے۔ اس وقت بھی کریملن کی دیوار اور لینن کے مقبرے کے درمیان بلکہ لینن کے قریب سے قریب ترین جگہ پانا کوئی اعزاز نہیں۔

لینن کے مقبرے اور دوسرے عظیم روسی رہنماؤں کی قبروں کی زیارت کے بعد ہم لوگ کریملن میں داخل ہوئے۔ کریملن زار شاہی زمانے کی یادگار ہے جس میں لینن ایک فاتح کے طور پر ۱۲ر مارچ ۱۹۱۸ء کو دن کے بارہ بجے پوری مزدورانہ شان کے ساتھ داخل ہوا۔ آج کریملن روسی کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کے اہم ترین دفاتر سے آباد ہے۔ ماسکو پورے روس کا دل ہے اور کریملن کو دیکھے بغیر ماسکو سے واپس جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص راشٹر پتی بھون، سنٹرل سکریٹریٹ اور لال قلعہ دیکھے بغیر دہلی سے واپس چلا جائے۔

کریملن کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ تاریخ بارہویں صدی سے شروع ہوتی ہے اور اس کی عمارتیں دیکھ کر دل پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو دہلی کا لال قلعہ، لاہور کا قلعہ یا آگرے کا قلعہ دیکھ کر۔ فرق صرف اتنا ہے کہ متذکرہ بالا قلعے آج صرف تاریخی نشانیاں بن کے رہ گئے ہیں اور کریملن ایک تاریخی نشانی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ حکومت روس کا جیتا جاگتا صدر دفتر بھی ہے۔!

زیرِ لب

(صفیہؔ کے خطوط اختؔر کے نام)

محبوب منزل

بھوپال

یکم جنوری ۵۱ء

اختر عزیز!

بہت سا پیار۔ تمھارا اچپیس کا لکھا ہوا خط مجھے جمعہ کو ہی مل گیا تھا، مستقل مصروفیت نے جواب لکھنے کی مہلت نہ دی۔ بارے کالج کا سارا پروگرام بخیر وخوبی انجام پاگیا۔ تمھاری ''ستاروں کی صدا'' بہت مقبول ہوئی۔ اس پوری پریشانی میں میری تسکین کا سامان یہی تھا۔

تم نے ایک آدھ بات ایسی لکھی ہے جس سے میں اتفاق نہیں کرسکتی۔ اختر تمھاری فطرت میں تھکاوٹ کا احساس آج تک مجھے نہیں ہوا۔ تمھاری ہر صلاحیت بھرپور طریقے پر آج بھی زندہ ہے۔ تم بے پناہ محبت اور شدید نفرت کرسکتے ہو۔ میں تمھاری محبت اور نفرت دونوں سے ہمیشہ خائف ہوں۔ یہ تمھاری کمزوری نہیں میری ہے اور سچ پوچھو تو یہ کمزوری بھی نہیں۔ میں بہہ جانے کی قائل نہیں رہی۔ میں نے تمھارے قدم بھی ہمیشہ زمین پر ٹکانے چاہے ہیں۔ اسے اگر تم یہ سمجھو کہ تمھیں میرے دل کی وہ محبت نہیں مل سکی جو تم چاہتے تھے تو میں یہ بات نہ مانوں گی اختر۔ تم چاہ سکتے ہو اور دیوانہ دار چاہ سکتے ہو۔ میری چاہت دیوانی ہوکر بھی حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرتی۔ محبت کے اس امتزاج کے سہارے ہی ہم یہاں تک پہنچے ہیں جہاں ہم ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور بے معنی رہ جاتے ہیں دوست۔ مجھے تو تم سے وہ ملا جو دنیا میں

تمھیں سے مل سکتا تھا۔ زندگی کے عظیم الشان تجربے‘ سماج کی عزت‘ بچے‘ گھر‘ کردار‘ شخصیت‘ سبھی کچھ تو میں نے تم سے پایا۔ پھر بھی تم ایسا سوچ کے دل دُکھاتے ہو کہ تم مجھے بہت کچھ نہ دے سکے۔ زندگی کے حالات الجھے ہوئے ہیں دوست! آؤ ایک دوسرے پر اعتماد بڑھائیں۔ تم میرے سامنے سرخرو اور سربلند ہو کر آؤ۔ تم نے مجھے ایک انوکھی اور نویلی زندگی دی ہے جو تمھارے بغیر میں نہ پا سکتی تھی۔ ایک شاعر کی بیوی ہونا کوئی معمولی مرتبہ نہیں اختر! میں اکثر سوچتی ہوں کہ اگر احساس کی یہ لطافتیں میرے حصے کی نہ ہوتیں تو یہ زندگی کتنی بے کیف ہوتی۔

اختر! تم میرے Prosaic پن سے گھبراؤ نہیں گو کہ یہ کمی مجھ میں ہے لیکن یہ غنیمت ہی ہے ورنہ ہم ضرور ہی حقیقتوں سے بھٹک جاتے اور حقیقتوں سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے دوست! وہ ہمارا پیچھا ضرور کرتیں‘ میرے دل کی گرمی‘ میرے سینے کا گداز‘ میرے ذہن کی روشنی‘ میری کلائی کی مضبوطی یہ سب کچھ تمھاری زندگی کے راستے میں صرف ہوں گی۔ تمھاری زندگی کے لیے یہی کچھ ہے میرے پاس اور پوری وفاداری کے ساتھ ہے یہ سب کچھ۔

تم اس احساس کو مٹا ڈالو اختر کہ آج تک تمھاری طرف سے کوئی کمی میرے ساتھ رہی ہے۔ اگر تمھیں میرے لیے یا مجھے تمھارے لیے کوئی قربانی دینی پڑی ہو گی تو اس کی ذمہ داری تو ان حالات پر ہے جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں۔ آج میں تم سے دور ہوں تنہا ہوں تو کیا تم کسی طرح بھی مجھ سے بہتر حالت میں ہو؟ کیا تم میری خاطر سختیاں نہیں جھیل رہے؟ یہ قربانیاں رائیگاں نہ جائیں گی۔

آؤ یہ نیا سال اس طرح شروع کرو کہ مجھ پر اعتماد پیدا کرو اور خود پر بھی۔ تمھارا حوصلہ دگنا ہو جائے گا۔ تمھاری محبت کے لازوال سرچشمے ابل پڑیں گے۔ تم جاگ جاؤ گے اور میرا سال!

”اسی کے نام سے جس کی محبت میری دنیا ہے۔“

پیار لو

تمھاری صفو

بھوپال

۳؍اپریل ۵۱ء

میرے ہی اختر!

ہزاروں پیار اور بہت سی دعائیں۔

تمھارا پہلی کا لکھا ہوا خط مجھے آج منگل ہی کو مل گیا۔ حسب اندیشہ تمھاری طبیعت حد سے زیادہ بدمزہ اور مکدر ملی۔ دوست! تم جانتے ہو کہ یہ دور عجیب خلفشار کا دور ہے۔ بقول شخصے ہر چہرے پر ناآسودہ خوشیوں اور نامراد امنگوں کی کہانی لکھی ہوئی ہے۔ تم اپنی ناآسودگی کو ذاتی شکست خوردگی کیوں سمجھو؟ آج دنیا کے مسائل ہی اس طرح الجھے ہوئے ہیں کہ ہمیں فی الحال کوئی روشن حل قریب نہیں دکھائی دیتا اور ہم بھی اس دنیا کا ایک حصہ ہیں۔ ہمیں بھی غیر مطمئن اور ناآسودہ رہنا ہے اور اسی طرح پوری بہادری سے جینا ہے۔ اس لیے کہ ہمارا یقین ہے اور ہمارا ایمان کہ اگر ہم نے یہ Fight برقرار رکھی تو جیت ہماری ہی ہوگی۔

دوست! اپنے گردوپیش نظر کرو۔ ممبئی میں بڑی آسانی سے قریب ہی تم کو ہزاروں مثالیں خود سے زیادہ ناآسودہ اور خود سے زیادہ شکست خوردہ شخصیتوں کی مل جائیں گی۔ میں تو شکر کرتی ہوں کہ ہم تو پھر بھی بہتوں سے بہتر حالت میں ہیں۔ تم برسرروزگار ہو۔ خدا نخواستہ کسی کے دست نگر نہیں۔ تمھارے بچے آرام سے ہیں اور اچھی طرح پل رہے ہیں۔ مجھے تمھاری محبت، تمھاری سرپرستی، تمھارا اعتماد، سبھی کچھ حاصل ہے اور تمھیں میری پوری ہستی، میری پوری زندگی، پھر ہم اپنے کو ہارے ہوئے انسانوں میں کیوں سمجھیں؟ تھک مت جاؤ ساتھی، یہ خود فریبی نہیں حقیقت ہے کہ آج نہیں تو کل ایک روشن سویرا بھی جھلک اٹھے گا۔

تنہائی اور اس طرح کی بے تکی زندگی بہت تکلیف دہ ہے مگر ذہنی سہارے بڑی تسکین کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری محبت، میری وفاداری اور میرا خلوص تمھیں اس شکست خوردگی کے احساس سے نجات نہ دلا سکا تو میں جان لوں گی کہ ضرور مجھ میں ہی کچھ کمی ہے جسے مجھے ضرور دور کرنا چاہیے؟ آخر تم نے خود کو مجھ سے

علاحدہ کیوں کیا؟ اور یوں طبیعت کو بدحظ کیوں کیا؟ خوش رہو' کھاؤ پیو' ہنسو اور بہت سا کام کرو اس یقین کے ساتھ کہ ایک گرم دل اور دو نازک دھڑکنیں تمھیں پیار' عزت' فخر اور غرور سے اپنا سمجھتے ہیں۔ تم کبھی بچوں کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ انھیں تم پر کتنا ناز ہے۔ زندگی کی یہ مسرتیں ہمیں ہر مخالفت اور ہر مزاحمت سے ٹکر لینے کے قابل بنا سکتی ہیں۔

گھبرا مت جاؤ دوست! میری طرف سے یہ اعتماد پیدا کرو کہ ہر کڑی گھڑی میں میرے لیے تمھارے ہی دم سے راحت ہے اور تمھاری ہی محبت سے تسکین' تمھاری بے پناہ دلداریاں اور تمھارا یہ گداز میری ہر چیز سے' یہاں تک کہ میری ہستی سے بھی زیادہ ہے' میں اس کا بدل تمھیں صرف اتنا ہی دے سکتی ہوں کہ میں تمھاری ہوں اور تمھاری ہر مشکل میری ہے۔ میں ہر مشکل کو راحت میں تبدیل کروں گی اور ہر دشواری کو تمھارے لیے آسان بناؤں گی۔ مجھ پر بھروسہ کرو اور خود پر بھی' پھر یہ شکست کا احساس تم میں نہ ابھرے گا ساتھی۔

اچھا آؤ معصوم بچوں کی طرح ہر آلودگی سے پاک ہو کر میرے سینے پر سر رکھ دو اختر! میں کبھی کبھی وہ محبت بھی دے سکتی ہوں جو بچے کو ماں سے ملتی ہے تاکہ وہ پروان چڑھ سکے۔ اختر آج سے تم ایسے خراب اندیشے ذہن میں نہ لانا۔ زندگی بہت قیمتی ہے اور عزیز' اور پھر تمھاری یہ زندگی' اس کی قیمت کوئی مجھ سے پوچھے' آؤ ہم ایک دوسرے سے مل کر ایک ہو جائیں۔

تمھاری صفو

حصہ نظم

غزلیات

ولی اورنگ آبادی

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں دل نئیں مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے جھانجھ کی جھنکار سناتی جا

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری ٹک اس کوں پجاتی جا

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کوں کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کو لگاتی جا

تجھ نیہ میں دل جل جل جوگی کی لیا صورت
یک بار اسے موہن چھاتی سوں لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

ولی اورنگ آبادی

قرار نئیں ہے مرے دل کوں اے سجن تجھ بن
ہوئی ہے دل میں مرے آہ شعلہ زن تجھ بن

شتاب باغ میں آ اے گل بہشتی رو
کہ بلبلاں کوں جہنم ہوا چمن تجھ بن

قران کب ہو میسر ترا اے زہرہ جبیں
ہر ایک آن ہے مجھ حق میں سو قرن تجھ بن

چمن کی سیر سوں نفرت ہے اس سبب کہ مجھے
سفید داغ سوں مکروہ ہے سمن تجھ بن

اے رشک چشمۂ خضر اپنے مکھ کی شمع دکھا
کہ ہے بہ صورت ظلمات انجمن تجھ بن

نہ کر تغافلی اے مصر حسن کے یوسفؑ
مثال دیدۂ یعقوبؑ ہیں نین تجھ بن

ولی کے دل کی حقیقت بیان کیوں کے کروں
گرہ ہوا ہے زباں پر مری سخن تجھ بن

میر تقی میر

چلتے ہو تو چمن کو چلیے ' کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں ' پھول کھلے ہیں ' کم کم بادو باراں ہے
رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں
آگے ہوے خانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے
عشق کے میداں داروں میں بھی مرنے کا ہے وصف بہت
یعنی مصیبت ایسی اٹھانا کارِ کارگزاراں ہے
دل ہے داغ، جگر ہے ٹکڑے ' آنسو سارے خون ہوئے
لوہو پانی ایک کرے ' یہ عشق لالہ عذاراں ہے
کوہ کن و مجنوں کی خاطر دشتِ و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میر نہایت پاسِ عزت داراں ہے

میر تقی میر

گئے تھے سیر چمن کو اٹھ کر گلوں میں ٹک جی لگا نہ اپنا
تلاش جوش بہار میں کی ' نگار گلشن میں تھا نہ اپنا
ملا تو تھا وہ بہ خواہش دل ' مزہ بھی پاتے ملے سے لیکن
پھریں جو مستی میں اس کی آنکھیں سو ہوش ہم کو رہا نہ اپنا
جہاں کا دریائے بے کراں تو سراب پایان کار نکلا
جو لوگ تہہ سے کچھ آشنا تھے انھوں نے لب تر کیا نہ اپنا
کہے بھی کوئی تو اس سے جس میں سخن کسی کا اثر کرے کچھ
بکا کیے ہم ہمیشہ ' مانا کسو دن ان نے کہا نہ اپنا
نہ ہوش ہم کو نہ صبر دل کو نہ شور سر میں نہ زور پا میں
جو رو ویں کس کس کو رو ویں اب ہم وفا میں کیا کیا گیا نہ اپنا
جہاں میں رہنے کو جی بہت تھا ' نہ کر سکے میر کچھ توقف
بنا تھی ناپائدار اس کی اسی سے رہنا بنا نہ اپنا

مرزا غالب

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مۓ گلفام' بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مرزا غالب

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

فانؔی بدایونی

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی ' بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

فانؔی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

فانی بدایونی

مآل سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

ابھی کیا ہے کسی دن خود رلائے گی یہ خاموشی
زبان حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ

غرور حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

بہار زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھو گے
کسی کا عیش مرگ ناگہانی دیکھتے جاؤ

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعش فانی دیکھتے جاؤ

مرزا یاسؔ یگانہ چنگیزی

کار گاہ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

کیمیائے دل کیا ہے خاک ہے مگر کیسی
لیجیے تو مہنگی ہے بیچئے تو سستی ہے

حسن بے تماشا کی دھوم کیا معمہ ہے
کان بھی ہیں نامحرم، آنکھ بھی ترستی ہے

خضر منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

بے دلوں کی ہستی کیا جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
خواب ہے نہ بیداری، ہوش ہے نہ مستی ہے

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر کے سادگی برستی ہے

ترک لذت دنیا کیجیے، تو کس دل سے
ذوق پارسائی کیا، فیض تنگ دستی ہے

دیدنی ہے یاسؔ اپنے رنج و غم کی طغیانی
جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

مرزا یاسؔ یگانہ چنگیزی

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

اسیرِ شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

دل بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

سیماب اکبر آبادی

دل اکثر شکریہ سنج جفائے یار ہوتا ہے
محبت کرنے والوں کا یہی کردار ہوتا ہے!؟

ازل کے خواب کیف انگیز سے سرشار ہوتا ہے
بڑی مشکل سے ذہن آدمی بیدار ہوتا ہے

مزاجِ حسن جب خوکردۂ پندار ہوتا ہے
تو "دل آزار" ہی کیا"زندگی آزار" ہوتا ہے

دل اہل نظر قبل سحر بے دار ہوتا ہے
یہی وقت کشود پردۂ اسرار ہوتا ہے

مجھے آتی ہے غیرت دیر اور کعبے کے قصوں پر
کہ جھگڑا بربنائے آستان یار ہوتا ہے

گراں ہوتی نہیں، ہو کوئی کیفیت محبت کی
وہ غم، غم ہی نہیں ہوتا جو دل پر بار ہوتا ہے

وفا کا نام لے ' یا ذکر کر عجز محبت کا
بہر صورت غرور عشق کا اظہار ہوتا ہے

وہاں تمئیز حسن و عشق ہو سکتی ہے مشکل سے
جہاں فرق جنون و ہوش بھی دشوار ہوتا ہے

مرے اشعار ہی سیماب ہوتے ہیں گراں ان پر
مجھی سے شعر کہنے کے لیے اصرار ہوتا ہے

سیماب اکبر آبادی

مغنی جاگتی سی اک فضا تیار ہو جائے
رجز خواں ہو کہ روح انجمن بیدار ہو جائے

خوشامد ناخدا کی اور طوفاں سے جھجکنا کیا
لگا جھنجھلا کے وہ ٹھوکر کہ بیڑا پار ہو جائے

ورود زندگی ہوگا انھیں قربان گاہوں میں
ذرا ہٹ جائیں لاشیں' راستہ ہموار ہو جائے

وہ فتنہ محو کر دینے' مٹا دینے کے قابل ہے
جو دانستہ مزاج زندگی پر بار ہو جائے

خزاں آئی ہے اب کے پیرہن میں موسم گل کے
چمن والے سمجھ جائیں' چمن ہشیار ہو جائے

مرے قابو میں آجائے اگر تار رگ ہستی
وہ جھنکادوں کہ ساز دو جہاں بیکار ہو جائے

گراں خوابیٔ تربت سے بھی جی گھبرا گیا اب تو
قیامت ہو نہ ہو' سرکارؐ کا دیدار ہو جائے

مجھے اے انقلاب وقت اسی دنیا میں رہنا ہے
نہ چھیڑ اتنا کہ دنیا ہی سے دل بیزار ہو جائے

پھر اے سیماب مایوسی کا اس کی کیا ٹھکانہ ہے
جسے مرنا بھی جینے کی طرح دشوار ہو جائے

مجروح سلطان پوری

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے
مگر اے ہم قفس، کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسمِ قید و زنداں، ایک دیوارِ کہن تک ہے
کہاں بچ کر چلی اے فصلِ گل، مجھ آبلہ پا سے
مرے قدموں کی گل کاری بیاباں سے چمن تک ہے
میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلانوشی مری کیا اک مئے ساغر شکن تک ہے
نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حالِ دلِ سوزاں
مہِ تاباں کہ جو اس کا شریکِ انجمن تک ہے
نوا ہے جاوداں مجروح جس میں روحِ ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

مجروح سلطان پوری

دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ
سر پر ہوائے ظلم چلے، سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجرِ فرنگ
سینے پہ زخمِ نو بھی ہے داغِ کہن کے ساتھ
جھونکے جو لگ رہے ہیں نسیمِ بہار کے
جنبش میں ہے قفس بھی اسیرِ چمن کے ساتھ
مجروح قافلے کی مرے داستاں یہ ہے
رہبر نے مل کے لوٹ لیا راہزن کے ساتھ

عزیز قیسی

ہر آنکھ لہو ساگر ہے میاں ہر دل پتھر سناٹا ہے
یہ گنگا کس نے پاٹی ہے یہ پربت کس نے کاٹا ہے

چاہت، نفرت، دنیا عقبیٰ، یہ خیر، خرابی، درد، دوا
ہر دھندا جی کا جوکھم ہے ہر سودا جان کا گھاٹا ہے

کیا جوگ سمادھی اور سدھی کیا کشف و کرامت جذب و جنوں
سب آگ ہوا پانی مٹی سب دال نمک اور آٹا ہے

یہ راس رنگ یہ میل ملن، اک ہاتھ میں چاند اک میں سورج
اک رات کا موج مزہ سارا اک دن کا سیر سپاٹا ہے

گھٹ گھاٹ اندھیرا ہے قیسیؔ باندھو گے کہاں نیا اپنی
آواز کسے دو گے قیسیؔ چودھام یہاں سناٹا ہے

عزیز قیسی

رات کی رات پڑاؤ کا میلہ، کوچ کی دھول سویرے
محل مکان کُٹیا چھپر سب بنجاروں کے ڈیرے

سورج ڈھلتے ہی گلیوں میں فتنے جاگ اٹھتے ہیں
رین نہیں جب اپنے بس میں، کیسے رین بسیرے

وہ تو ہم سے سادہ دلوں کا حشر یہی ہونا تھا
ورنہ تم سے ترک وفا کے حیلے تھے بہتیرے

جان بچے گی تو پہنچیں گے دادرسوں کے گھر تک
گلی گلی میں موڑ موڑ پر ٹھگ ہیں رستہ گھیرے

چل قیسیؔ میلے میں چل کیا رونا تنہائی کا
کوئی نہیں جب تیرا میرا سب میرے سب تیرے

قیصر الجعفری

حصہ مرے مکاں کا، شب ماہ میں نہ تھا
یہ دشت چاندنی کی گزرگاہ میں نہ تھا

چارہ گروں کے ظرف کو پہچانتا تھا میں
دل میں جو کرب تھا وہ مری آہ میں نہ تھا

میری انا کسی کی شریک سفر نہ تھی
میرے سوا کوئی بھی مری راہ میں نہ تھا

کس نے نہیں دیا مرے شب خوں کا مشورہ
یاروں میں کون تھا جو کمیں گاہ میں نہ تھا

خوشبو میں ڈھل گیا کہ دھواں بن کے اڑ گیا
میرے لہو کا داغ کہیں راہ میں نہ تھا

دوری پہ بجھ گئی نہ محبت کی روشنی
اس کے بدن کا عکس مری چاہ میں نہ تھا

بے سایہ، زندگی کا سفر کاٹنا پڑا
یادوں کا سائباں بھی کہیں راہ میں نہ تھا

قیصر الجعفری

پھر مرے سر پہ کڑی دھوپ کی بوچھار گری
میں جہاں جا کے چھپا تھا، وہیں دیوار گری

لوگ قسطوں میں مجھے قتل کریں گے شاید
سب سے پہلے مری آواز پہ تلوار گری

اور کچھ دیر مری آس نہ ٹوٹی ہوتی
آخری موج تھی جب ہاتھ سے پتوار گری

اگلے وقتوں میں سنیں گے در و دیوار مجھے
میری ہر چیخ، مرے عہد کے اس پار گری

خود کو اب گرد کے طوفاں سے بچاؤ قیصر
تم بہت خوش تھے کہ ہمسائے کی دیوار گری

ظفر گورکھپوری

زندگی نے مجھے سوغات انوکھی دی ہے
تیشہ اک ہاتھ میں، اک ہاتھ میں بنسی دی ہے
کون جانے کہ ہوس جسم سے کیا کیا لے جائے
چور کے ہاتھ میں صندوق کی کنجی دی ہے
کتنی آسانی سے مشہور کیا ہے خود کو
میں نے اپنے سے بڑے شخص کا گالی دی ہے
زندگی دی ہے مجھے آگ کے دریا کی طرح
پار اترنے کے لیے موم کی کشتی دی ہے
بے تحاشہ میں ترے گھر کی طرف بھاگا ہوں
ان مشینوں نے ذرا دیر جو چھٹی دی ہے
کیسے بھیگے ہوئے ہاتھوں سے سنبھالو گے ظفر
اس نے کاغذ پہ بنا کر تمھیں تتلی دی ہے

ظفر گورکھپوری

دیکھیں قریب سے بھی تو اچھا دکھائی دے
اک آدمی تو شہر میں ایسا دکھائی دے
اب بھیک مانگنے کے طریقے بدل گئے
لازم نہیں کہ ہاتھ میں کاسہ دکھائی دے
نیزے پہ رکھ کے اور مرا سر بلند کر
دنیا کو اک چراغ تو جلتا دکھائی دے
دل میں ترے خیال کی بنتی ہے اک دھنک
سورج سا آئینے سے گزرتا دکھائی دے
چل زندگی کی جوت جگائے، عجب نہیں
لاشوں کے درمیاں کوئی رستہ دکھائی دے
ہر شے مرے بدن کی ظفر قتل ہو چکی
اک درد کی کرن ہے کہ زندہ دکھائی دے

نظمیں

نظیر اکبر آبادی

روٹی

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں　　　پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں　　　سینے اُپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا　　　کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا
دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا　　　ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے　　　خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے　　　جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں پور پور　　　آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور　　　ہر گز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

روٹی جب آئی پیٹ میں سو قند گھل گئے
گلزار پھولے آنکھوں میں اور عیش تل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آ کے ڈھل گئے
چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کھل گئے
یہ کشف یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر 'خواہش باغ و چمن نہ ہو
بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
لمبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہے روٹی کے واسطے
سب کشف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے سے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

روٹی کے ناچ تو ہیں سبھی خلق میں بڑے
کچھ بھانڈ بھگتیے' یہ نہیں پھرتے ناچتے
یہ رنڈیاں جو ناچے ہیں گھونگھٹ کو منہ پہ لے
گھونگھٹ نہ جانو دوستو زنہار تم اسے
اس پردے میں وہ اپنی کماتی ہیں روٹیاں

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر
روکھی ہی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یا پتلی ہوئے موٹی' خمیری ہو یا فطیر
گیہوں جوار باجرے کی جیسی بھی ہو نظیرؔ
ہم کو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

مرزا محمد رفیع سودا

ہاتھی

ہوئی آقا پہ اس کے تنگ دستی — کیا کرتا ہے اب وہ فاقہ مستی
بدن پر اب نظر آتی ہے یوں کھال — طناب ست سے خیمے کا جوں حال
نمودار اس طرح ہر استخواں ہے — گویا ہر پسلی اس کی نردباں ہے
نہ بیڑی ہے نہ کٹھ بندھن نہ لکڑا — رکھے ہے ناتوانی اس کو جکڑا
ضعیفی نے کی اس کی فربہی گم — گیا ہاتھی نکل اور رہ گئی دم
کہا اس کے مہاوت سے میں اک روز — اگر آقا کے اپنے ہے تو دل سوز
تو کہہ ان سے کہ اس کو بیچ ڈالیں — عوض کاش اس کے چڑھنے کو گدھا لیں
دیا اُن نے جواب اے میرے مخدوم — خریداری تو اس کافر کی معلوم
بڑا ہے بد قوارہ زشت و ناپاک — کہ پیٹھ اس کی بلند اور پیٹ کا داک
سمجھنا فیل اسے دیوانہ پن ہے — کسی مدت کا یہ بام کہن ہے
ستوں اس کے تلے یہ پاؤں ہیں چار — رہے دو دانت آگے سو ہیں اڑوار
جو بیٹھے یہ تو اٹھنا ہے اسے دور — لگیں جب تک نہ اس کو راج و مزدور
اٹم ہے خاک کا یا راکھ کا ڈھیر — کہیں ہیں اس کو ہاتھی ہے یہ اندھیر
ہے اتنا چلنے میں بجر یہ بدذات — نہیں ہاتھی صعوبت کی ہے یہ رات
یہ عالم چلنے میں خرطوم کا ہے — کہ دست کور میں گویا عصا ہے

جو کہیے فیل اسے بہتان ہے یہ
عجائب تودہ طوفان ہے یہ

مناجات و شہادت امام حسینؑ

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے　　ظلم کی چاند پہ زہراؑ کے گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکر اعداء میں صف آرائی ہے　　یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسے کو ہے شور ستم گاروں میں

زخمی بازو ہیں کمر خم ہے، بدن میں نہیں تاب　　ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہے قدموں سے رکاب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں پُر آب　　تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کو جواب
شدت ضعف میں جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سینکڑوں تیر ستم تن سے گزر جاتے ہیں

گیسو آلودہ خون لپٹے ہیں رخساروں سے　　شانے کٹ کٹ کے لٹک آتے ہیں تلواروں سے
تیر پیوست ہیں خون بہتا ہے سوفاروں سے　　لاکھ آفت میں ہے اک جان دل آزاروں سے
فکر ہے سجدۂ معبود میں سر دینے کی
وار سے تیغوں کی فرصت نہیں دم لینے کی

خوں میں تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے　　ہے جبیں چاند سی پُر نور مگر زخمی ہے
سینہ سب برچھیوں سے تا بہ کمر زخمی ہے　　تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے
ضرب شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آ کر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے　　　مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آ جاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے　　　بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے

گرد زہراؑ و علیؑ گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دوجہاں گرتے ہیں

زیں سے ہوتا ہے جدا دوش محمدؐ کا مکیں　　　چمن فاطمہؑ کا سرو ہے مائل بہ زمیں
برچھیاں گرد ہیں اور بیچ میں ہے سرور دیں　　　ہے یہ نزدیک گرے مُہر نبوت کا نگیں

پاؤں ہر بار رکابوں سے نکل جاتے ہیں
یاعلیؑ کہتے ہیں حضرت تو سنبھل جاتے ہیں

لاکھ تلواریں ہیں اور ایک تن اطہر ہے　　　ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سینکڑوں خنجر فولاد ہیں اور اک سر ہے　　　نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے

باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اٹھا سکتے نہیں
سامنے اہل حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں

کوئی سیہ کار نہیں آہ بچانے والا　　　حربے لاکھوں ہیں اور اک زخم اٹھانے والا
پیاس میں کوئی نہیں پانی پلانے والا　　　سنبھلے کس طرح بھلا برچھیاں کھانے والا

چرخ سے آگ برستی ہے زمیں جلتی ہے
مارے گرمی کے زباں خشک ہے لو چلتی ہے

کہیں دم لینے کو سایہ نہیں ہے وقت زوال　　　اینٹھی جاتی ہے زباں پیاس کی شدت ہے کمال
کبھی زینبؑ کا ہے غم گاہ سکینہ کا خیال　　　دن جو ڈھلتا ہے تو حضرت ہوئے جاتے ہیں نڈھال

مثل خورشید بدن ضعف سے تھراتا ہے
نیر برج امامت پر زوال آتا ہے

ساقی نامہ

ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار!

گل و نرگس و سوسن و نسترن!
شہیدازل لالہ خونیں کفن!

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں!

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی

اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھاکر نکلتی ہوئی

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ!
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ!

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام!

پلادے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصل گل روز روز!

وہ مے جس سے روشن ضمیرحیات!
وہ مے جس سے ہے مستی کائنات!

وہ مے جس میں ہے سوزوساز ازل!
وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل!

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑادے ممولے کو شہباز سے!

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش راز فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ!

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر وسلطاں سے بیزار ہے!

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا!

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے!

دل طور سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم!

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش!

تمدن ' تصوف ' شریعت ' کلام
بتان عجم کے پجاری تمام!

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی!

لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب
مگر لذت شوق سے بے نصیب!

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا ' حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر!
جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے!
دل مرتضیٰؓ سوز صدیقؓ دے

جگر سے وہی تیر پھر پار کر!
تمنا کو سینوں میں بیدار کر!

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر!
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر!

جوانوں کو سوز جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر!

بتا مجھ کو اسرار مرگ وحیات
کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات!

مرے دیدہ تر ' کی بے خوابیاں!
مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں!

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز!
مری خلوت وانجمن کا گداز!

امنگیں مری، آرزوئیں مری امیدیں مری، جستجوئیں مری!
مری فطرت آئینہ روز گار! غزالان افکار کا مرغزار!
مرا دل، مری رزم گاہ حیات! گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات!
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر! اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر!
مرے قافلے میں لٹا دے اسے!
لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے!

فیض احمد فیضؔ

کتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانہ کی پھٹکار سرمایہ ان کا
جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

نوالہ

ماں ہے ریشم کے کارخانے میں
باپ مصروف سوتی مل میں ہے
کوکھ سے ماں کی جب سے نکلا ہے
بچہ کھولی کے کالے دل میں ہے
جب یہاں سے نکل کے جائے گا
کارخانوں کے کام آئے گا
اپنے مجبور پیٹ کی خاطر
بھوک سرمائے کی بڑھائے گا
ہاتھ سونے کے پھول اگلیں گے
جسم چاندی کا دھن لٹائے گا
کھڑکیاں ہوں گی بینک کی روشن
خون اس کا دیے جلائے گا
یہ جو ننھا ہے بھولا بھالا ہے
خونیں سرمائے کا نوالہ ہے
پوچھتی ہے یہ اس کی خاموشی
کوئی مجھ کو بچانے والا ہے؟

مرے عہد کے حسینو

وہ ستارے جن کی خاطر کئی بے قرار صدیاں
مری تیرہ بخت دنیا میں ستارہ وار جاگیں
کبھی رفعتوں پہ لپکیں، کبھی وسعتوں سے الجھیں
کبھی سوگوار سوئیں، کبھی نغمہ بار جاگیں

وہ بلند بام تارے، وہ فلک مقام تارے
جو نشان دے کے اپنا رہے بے نشاں ہمیشہ
وہ حسین نور زادے، وہ خلا کے شاہزادے
جو ہماری قسمتوں پر رہے حکمراں ہمیشہ
جنھیں مضمحل دلوں نے ابدی پناہ جانا
تھکے ہارے قافلوں نے جنھیں خضرِ راہ جانا
جنھیں کمسنوں نے چاہا کہ لپک کے پیار کرلیں
جنھیں مہ وشوں نے مانگا کہ گلے کا ہار کرلیں
جنھیں عاشقوں نے چاہا کہ فلک سے توڑ لائیں
کسی راہ میں بچھائیں، کسی سیج پر سجائیں
جنھیں بت گروں نے چاہا کہ صنم بنا کے پوجیں
یہ جو دور کے حسیں ہیں انھیں پاس لا کے پوجیں

جنھیں مطربوں نے چاہا کہ صداؤں میں پرولیں
جنھیں شاعروں نے چاہا کہ خیال میں سمولیں
جو ہزار کوششوں پر بھی شمار میں نہ آئے
کبھی خاکِ بے بضاعت کے دیار میں نہ آئے
جو ہماری دسترس سے رہے دور دور اب تک
ہمیں دیکھتے رہے ہیں جو بصد غرور اب تک

مرے عہد کے حسینو! وہ نظر نواز تارے
مرا دورِ عشق پرور تمھیں نذر دے رہا ہے
وہ جنوں جو آب و آتش کو اسیر کر چکا تھا
وہ خلا کی وسعتوں سے بھی خراج لے رہا ہے
مرے ساتھ رہنے والو ' مرے بعد آنے والو
مرے دور کا یہ تحفہ تمھیں سازگار آئے
کبھی تم خلا سے گزرو کسی سیم تن کی خاطر
کبھی تم کو دل میں رکھ کر کوئی گلعذار آئے

ایک لڑکا

دیار شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کمسنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے، سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں، جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں، بہت خوش کام دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ سا، کبھی جیوں چشم خوں بستہ
ہوا میں تیرتا، خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا مڑتا
مجھے اک لڑکا، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہمزاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا

تعاقب کر رہا ہے ' جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو

خدائے عزوجل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بستر کم خواب ہو' دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے' یہ خیمۂ افلاک کا سایہ
اسی کی بخششیں ہیں' اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا اک حد فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے' خاک اسفل سے
مری تخلیق کی' مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے کانیں لعل وگوہر سے
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کر دی ہیں
وہ حاکم قادر مطلق ہے یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ہے' خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں ' اس کی رحمت اور سخاوت ہے
اسی نے خسروی دی ہے لئیموں کو مجھے نکبت
اسی نے یا وہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا' در یوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج' اندوہ پرور ' اضطراب آسا

جسے تم پوچھتے رہتے ہو، کب کا مرچکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مرچکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں

رباعیات

فراقؔ گورکھپوری

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سرگم
ہو رقص میں جیسے رنگ و بو کا عالم
جگمگ جگمگ ہے شبستان ارم
یا قوس قزح لچک رہی ہے پیہم

چڑھتی جمنا کا تیز ریلا ہے کہ زلف
بل کھاتا ہوا سیاہ کوندا ہے کہ زلف
گوکل کی اندھیری رات دیتی ہوئی لو
گھنشیام کی بانسری کا لہرا ہے کہ زلف

جوشؔ ملیح آبادی

محشر میں پہنا رہے ہیں مجھ کو زنجیر
اک بندۂ مجبور کی آخر تقصیر
آواز تو دو کوئی، کدھر ہیں آخر
ماحول و وراثت و سرشت و تقدیر

برسات ہے دل کو ڈس رہا ہے پانی
فرقت میں تری جھلس رہا ہے پانی
دل میں کبھی چبھتا ہے، کلیجے میں کبھی
آڑا ترچھا برس رہا ہے پانی

امجدؔ حیدر آبادی

کس شان سے شیخ خود نما بیٹھا ہے
سچ مچ کوئی سمجھے کہ خدا بیٹھا ہے
صورت میں ہے بایزید سیرت میں یزید
چمڑے پہ ہرن کے بھیڑیا بیٹھا ہے

تا عرش پہنچتی ہے فغاں کی آواز
کس درجہ قوی ہے ناتواں کی آواز
ہم جا نہیں سکتے جس جگہ اے امجدؔ
واں، جاتی ہے جان خستہ جاں کی آواز

جاں نثار اختر

افسردہ و مغموم نظر آتی ہے
ہر عیش سے محروم نظر آتی ہے
میں تیرے تاثرات غم کے صدقے
تو اور بھی معصوم نظر آتی ہے

جیون کی یہ چھائی ہوئی اندھیاری رات
کیا جانئے کس موڑ پہ چھوٹا ترا سات
پھرتا ہوں ڈگر ڈگر اکیلا لیکن
شانے پہ مرے آج تلک ہے ترا ہات

انشا اور تلفظ

مصنف : رشید حسن خاں

صفحات : 72

قیمت : -/45 روپے

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

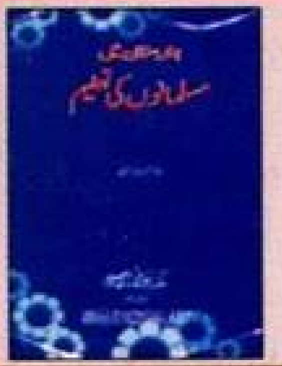

مصنف : سلامت اللہ

صفحات:200

قیمت : -/76 روپے

عبارت کیسے لکھیں

مصنف : رشید حسن خاں

صفحات : 136

قیمت : -/60 روپے

اسلام دورِ حاضر میں (منتخب مضامین)

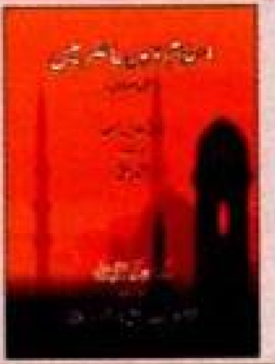

ترتیب : مشیر الحق

صفحات : 208

قیمت : -/75 روپے

برکت ایک چھینک کی

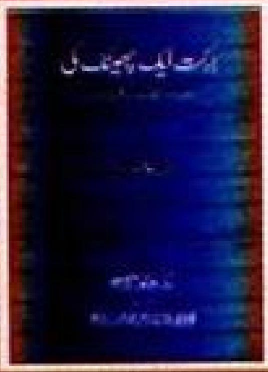

مصنف : وجاہت علی سندیلوی

صفحات:112

قیمت : -/53 روپے

انتخاب مضامین سرسید

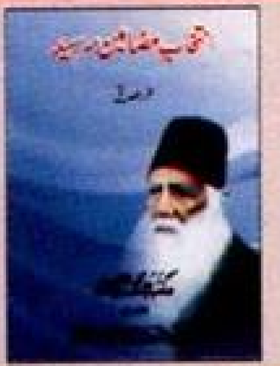

مصنف : انور صدیقی

صفحات : 140

قیمت : -/52 روپے

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست کل اور آج

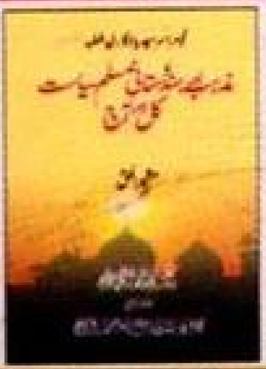

ترتیب : مشیر الحق

صفحات : 36

قیمت : -/36 روپے

انتخابِ نظیر اکبرآبادی

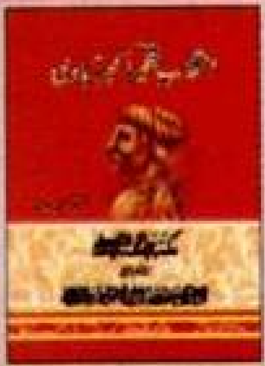

مصنف : رشید حسن خاں

صفحات : 280

قیمت : -/77 روپے

ISBN: 978-81-7587-938-6

9 788175 879386

₹ 74/-